جلد ۹۳ اپریل ۱۹۸۰ء عدد ۲

ماھنامہ

ترجمان القرآن

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمۂ قرآن مجید

مع مختصر حواشی

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

اس میں

مترجم نے قرآنِ حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے
ساتھ بہت مختصر حواشی درج کردیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآن مجید
کا سیدھا سادہ مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں تفہیم القرآن
کے خلاصے سے فائدہ اُٹھاسکیں۔

دُوسرا ایڈیشن ◉ ہدیہ =/۹۰ روپے

اِدارہ ترجمانُ القرآن ○ اچھرہ ○ لاہور

فون نمبر : ۴۱۰۳۱۶

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۳	اپریل ۱۹۸۰ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ	عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۱۰۱۶ ——— ۴۱۰۳۱۶

زرِ سالانہ بیس روپے - فی پرچہ ۲/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: سید حسین فاروق مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

میں نے اپنے عزیز ساتھی کی ساری باتیں سنیں، اور پھر اُس سے کہا:-

عزیزِ من! آپ میں یہ احساس کیوں پیدا ہوا کہ آپ کے پاس کوئی کام نہیں؟ حق و انصاف کی گواہی دینے والے خدا کے سپاہیوں پر کبھی کوئی لمحہ ایسا نہیں آتا کہ اُن کے پاس کوئی کام نہ رہے، وہ فارغ ہوں اور پریشان ہونے لگیں۔

آپ اس انتظار میں رہنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ کوئی دوسرا آ کر اُکسائے اور چونکائے۔ کوئی منت سماجت کرے یا زجر و توبیخ سے کام لے۔ آپ سے کام لینے والا آپ کے اپنے اندر کیوں نہیں ہے؟ آپ کا ایمان آپ کو نشتر کیوں نہیں چبھوتا اور آپ کا وعدہ و میثاق آپ کو بار بار کیوں نہیں جھنجھوڑتا؟

آپ اپنا رُوئے سخن خدا کی طرف کر کے اس سے کیوں نہیں پوچھتے کہ میرے لیے کیا کام ہے؟ آپ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کی محفل آراستہ کر کے وہاں کیوں سوال نہیں کرتے کہ میری راہِ عمل کدھر جاتی ہے؟ سیرت و سوانح کا نورانی دفتر موجود ہے اس سے معلوم کیجیے کہ ایک مسلم کیا کرے؟

خرابی یہ ہے کہ دین کا کام ابھی تک آپ کا ذاتی کام نہیں بنا۔ اس ذاتی کام، اصل دلچسپیاں، اصل سرگرمیاں، اصل رشتے رابطے دوسرے ہیں۔ دین کو آپ کسی دوسری قوت کی طرف سے عاید شدہ کام سمجھتے ہیں۔

حالانکہ آپ نے خدا کے ہاں مزدوری کرنے والے محنت کاروں میں نام لکھوایا اور خدا کی

فوج میں آپ سپاہی بھرتی ہوتے ہیں۔ ایک مزدور خوب جانتا ہے کہ اسے مالک کے کارخانے یا باغ یا کھیت میں کیا کام کرنا ہے، اسی طرح ایک سپاہی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ کن طاقتوں سے جنگ ہے اور وہ کہاں کہاں ہیں، کدھر کدھر سے کیا حملہ کر رہی ہیں اور ان کا مقابلہ کس کس محاذ سے کیسے کیسے کرنا ہے۔ آپ دوسروں کی طرف سے تجویزوں کا انتظار کرتے ہیں، آپ خود کیوں نت نئی مفید تجویزیں نہیں سوچتے؟ آپ بنے بنائے منصوبے مانگتے ہیں۔ آخر خود کیوں منصوبے تیار نہیں کرتے۔

عزیز بھائی! مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسا صاحبِ علم و فکر اور مالکِ عزم و کردار قائد آپ سے جدا ہوگیا ہے اور یقیناً اس کا صدمہ ہونا چاہیے۔ لیکن آپ کی باتوں سے ایسا تاثر جھلکتا ہے گویا کہ بات ختم ہوگئی۔ اب ویسا کوئی نہیں آئے گا اور ویسا نہیں ہوگا تو پھر کام کیسے ہو سکتا ہے۔

مولینا مودودی پر ایسی موت وارد نہیں ہوئی ہے کہ ان کی فکر اور ان کی تحریک ان کے نظر سے اوجھل ہوتے ہی ہوا میں اُڑ جائیں۔ وہ نہیں رہے تو بھی ان کا قائدانہ فیض ہم میں جاری ہے۔ اور پھر شریعت کے جس تصورِ قیادت سے انہوں نے ہمیں آشنا کیا ہے اس کے لحاظ سے اگر کوئی شخص نیت کا مخلص، دین کے مقاصد کو جاننے والا اور ہم سفروں کی مرضی اور ہم سفروں کے مشورے کے ساتھ قافلے کو لے چلنے والا ایسا مل سکے جسے ہم اپنے اندر بہتر پاتے ہوں تو پھر اس کا احترام کیا جائے گا، اس کی اطاعت کی جائے گی، اور اس کو اس کمزورکن احساس میں پڑنے نہیں دیا جائے گا کہ وہ چونکہ مولینا مودودیؒ نہیں ہے اس وجہ سے وہ کام نہیں چلا سکتا۔ ہمیں اسے یہ احساس دلانا ہے کہ اپنے معزز منصب کی وجہ سے تم بھی ہمیں ویسے ہی عزیز ہو، تم بھی ہماری بزم میں ایسے ہی فانوس روشن ہو اور ہم تمہارے ایک ایک اشارے پر اسی طرح چلیں گے جس طرح مولینا مودودیؒ کے دور میں ہوتا رہا ہے چاہے اس کی علمی سطح کمتر ہو، چاہے اس کی بعض آرا مختلف بھی ہوں، چاہے اس کا اسلوبِ کار کسی قدر جداگانہ انداز رکھتا ہو، چاہے اس کا مزاج مختلف ہو۔ ہم صرف یہ چاہیں گے کہ ہمیں معروف کا حکم دیا جائے اور منکر سے روکا جائے اور تمام معاملات مشوروں سے

انجام پائیں ۔ تمام لوگوں کو مقررہ دستوری اسالیب سے بات کرنے کا، اختلافات کرنے کا اور تنقید و محاسبہ کرنے کا حق حاصل رہے ۔ یہ سب کچھ اگر حاصل رہے تو سمجھو کہ مولٰنا مودودیؒ کی قیادت جاری ہے ۔

اجتماعیت کی ایک شرط اسلام میں یہ ہے کہ اگر دینی مقاصد کے لیے نظامِ مشاورت کے ساتھ کام چلایا جا رہا ہو تو آپ اجتماعیت کے مقررہ اداروں یا مناصب سے تو بس خطاب کر سکتے ہیں، مگر متفرق محفلوں میں آپ اجتماعیت کے فیصلوں پر منفی یا تنقیدی رائیں نہیں دے سکتے ۔ ورنہ نجویٰ کا راستہ کھول دینے کے بعد کوئی اجتماعیت صحت مندانہ خطوط پر نہیں چل سکتی ۔ براہ کرم کبھی بھی نجویٰ کے طرز پر غلط جگہوں پہ باتیں نہ کریں ۔ ورنہ آپ کا جذبۂ اخلاص تباہ ہو جائے گا ۔

لیکن آج بڑی مشکل یہ ہے کہ سرے سے اجتماعیت کا ڈھانچہ توڑ دیا گیا ہے اور فرد فرد بکھر گیا ہے ۔ اس تبدیلی کا ایک تجربہ ہمیں پہلے ہو چکا ہے کہ ہم نے تنہا رہ کر اپنے جذبۂ ایمانی کے چراغوں کو روشن رکھنے کے ساتھ معاشرے میں نفوذ کر کے دعوتِ حق پہنچانے کے نت نئے راستے نکالے ہیں ۔ آج کوئی انوکھی آزمائش درپیش نہیں ۔ اس وقت ہر فرد کو ایک امت بن کر کام کرنا ہے ۔

ایسے مرحلۂ آزمائش میں سب سے زیادہ خطرہ یہ ہوتا ہے کہ افراد اگر پہلے سے باشعور اور تربیت یافتہ نہ ہوں تو الگ الگ بولیاں بولنے لگتے ہیں اور طرح طرح کے اختلاف رونما ہو جاتے ہیں ۔ اسی لیے حضورؐ نے انتباہ دیا تھا کہ اجتماعیت سے محروم آدمی تو ریوڑ سے کٹی ہوئی ایک بکری کی طرح ہے جسے گرگ طینت شیطان لقمہ بنا لیتا ہے ۔ مگر دین تو اس لیے بھی ہے کہ بکریوں کو اتنی شیری سکھا دے کہ اگر کبھی ریوڑ رہے بھی نہیں تو تنہا بکری بھی اپنی حفاظت کر سکے ۔

ایسے دورِ خلا میں ایک خطرہ اور بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ آدمی نے جن دلچسپیوں کو چھوڑ دیا تھا جس سلسلۂ مفادات سے انقطاع کر لیا تھا جن غیر ضروری تعلقات کو فراموش کر دیا تھا، وہ چاروں طرف سے اُٹھ آتے ہیں ۔ دولت کمانے کا جنون، جائیدادیں بنانے کے پروگرام، بیوی بچوں کی دبی ہوئی دلچسپیاں اور قبیلے اور خاندان کے ناقابلِ قبول رواج سب اپنا اپنا دباؤ ڈالتے ہیں، یہاں تک کہ ایک مردِ حق

ان میں پوری طرح منہمک ہو جاتا ہے۔ نہ اُس کے پاس وقت رہتا ہے، نہ حقیقی لگن باقی رہتی ہے اور اپنی اس زوال پذیر حالت پر ضمیر کو مطمئن رکھنے کے لیے وہ پکارتا ہے کہ کوئی بتائے کہ مجھے کیا کام کرنا چاہیے۔

عزیزمن اگر نماز روزہ کی ادائی کے لیے کسی سے پوچھنا نہیں پڑتا تو آخر دعوتِ حق کو خدا کے بندوں تک پہنچانے، خدمت کے کام کرنے، لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے، دینی و ملّی مقاصد کی طرف عوام کو توجہ دلانے کے کاموں میں کسی سے دریافت کرنا کیا ضروری ہے؟ نماز با جماعت ادا کرنے پہ اگر کہیں پابندی ہے تو اپنی اپنی انفرادی نماز پر تو کوئی قدغن نہیں!

عزیزمن! میں نے تمہیں اپنوں اور بیگانوں کے درمیان بیٹھ کر مایوسی پھیلاتے ہوئے دیکھا ہے۔ میرے شعور کے مطابق یہ بہت بڑا جرم ہے کہ لوگوں کو دین، دعوتِ دین، اسلامی تحریک، اسلامی شخصیتوں یا اسلامی اداروں کے متعلق مایوس کیا جائے، یا کسی بھی ایسی تنظیم (موجودہ یا سابق) کے متعلق بدظن کیا جائے جس نے انہیں توانائی بخشی ہو۔

مسلط شدہ باطل نظاموں اور غیر اسلامی حکومتوں کے خلاف اُٹھنے والے کمزور اور قلیل التعداد اور بے سروسامان لوگوں کا سرمایہ کار ہی ایمان و امید ہوتا ہے۔ ایمان و امید ہی کی برکت سے اُن کی تعداد بڑھتی ہے۔ ان میں قوت آتی ہے، وہ شدائد کا مقابلہ کرتے ہیں، وہ جدوجہد کی طویل ہوتی ہوئی راہوں پر صبر سے مارچ کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ آخر وہ کامیابی تک پہنچتے ہیں۔ ایمان یا امید کی قوت کو اگر کمزور کر دیا جائے تو دین کا سارا کام خراب ہو کے رہ جائے گا۔

لوگوں کو دین کے متعلق یہ امید رہنی چاہیے کہ یہ غالب ہو سکتا ہے بلکہ ضرور ہو گا۔ پھر جس شخص یا جماعت نے دین کے متعلق اُن کی اُمیدیں استوار کی ہیں، اس کے ساتھ بھی اُن کی اُمیدوں کو وابستہ رہنا چاہیے کہ یہ قوت ہمیں کامیابی کی طرف لے جا سکتی ہے اور لے جا رہی ہے۔ کسی جماعت کے ساتھ اُمیدیں اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہیں کہ اُس کی قیادت کو مطعون و معتوب نہ کیا جائے (ماسوا اس کے کہ مخصوص وجوہ موجود ہوں اور اپنی آواز مقررہ تنظیمی راستے سے اُٹھائی جائے اور ضرورت ہو تو قیادت کو بدل دیا جائے)۔

لیکن آج جس جماعت کا نظم موجود ہی نہیں، اس کے بکھرے ہوئے ارکان میں تو مصیبت زدگی کا احساس ہونا چاہیے۔ جیسے کسی بستی میں زلزلہ آ گیا ہو، مکان گر گئے ہوں اور لوگ پراگندہ ہو گئے ہوں۔ ایسے نظم کے لیڈر، دانشور، ارکان، کارکن، ہمدرد اور متفق سب کے سب مصیبت زدہ ہیں۔ ان میں باہم صرف ہمدردی و دلسوزی کا رشتہ ہو سکتا ہے۔ ایک دوسرے پر اعتراض اٹھانے اور ایک دوسرے سے متعلق مایوسی کا اظہار کرنے کا یہ کونسا موقع ہے۔ جو لوگ دوسروں سے مایوسی کا آغاز کرتے ہیں ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے مایوس ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ سے مایوسی جدوجہد کی اس دنیا میں ایک طرح کی خودکشی ہے۔

وہ کرب جو ایک معطل شدہ دینی جماعت کا کارکن محسوس کرتا ہے کہ اب اسے کہیں سے رہنمائی نہیں مل رہی ہے، اس کے مقابلے میں سابق اہل قیادت کا کرب دسیوں گنا زیادہ ہے جو یہ محسوس کرتے ہوں گے کہ جس بھاری بھرکم مشینری کو چلانے کے وہ ذمہ دار تھے۔ اسے ان کے سامنے سے غائب کر دیا گیا اور اس کے تمام پرزے الگ الگ ہو چکے ہیں۔ اب خود ان اکابر میں سے بھی ہر فرد کسی عام کارکن کی طرح ایک فرد تنہا بن کر رہ گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کارکنان کو ذاتی کرب سے بڑھ کر اپنے سابق اہل قیادت کے بھاری اور وسیع کرب کو محسوس کرنا چاہیے اور ان کے لیے انتہائی دلسوزی ان میں کار فرما ہونی چاہیے۔

اس حالت میں تو صورت تلافی ایک یہی ہے کہ ہر فرد تنہا ہو کر بھی پہلے سے زیادہ ایمان، پہلے سے زیادہ امید کے ساتھ، اور پہلے سے زیادہ سرگرمی سے کام کرے تاکہ جب کبھی حالات اپنی جگہ پر واپس ہوں تو ہر ایک یہ محسوس کرے کہ اس غیر تنظیمی دور میں ہم نے ذہن اور کردار اور ماحول پر اثر اندازی کے لحاظ سے بہت اچھی نشوونما پائی ہے، اور ہم پہلے سے زیادہ بڑی قوت بن چکے ہیں۔

عزیزمن! تم اگر خدا سے باندھے ہوئے میثاق پر قائم ہو تو چاہیے تھا کہ وقت نکال کر گھر سے دعوت حق کا علم اٹھا کر نکل کھڑے ہوتے، محلے کے ایک ایک دروازے پر دستک دیتے، خاندان کے ایک ایک فرد سے ملتے، خاص خاص تعلقات کے دائروں میں پہنچتے، دیہات کو روانہ ہو جاتے، ہسپتالوں اور جیلوں کے مصیبت زدگان تک پہنچتے، مسجدوں کے حلقہ ہائے درس اور دائرہ ہائے ذکر و فکر میں

شامل ہوتے، ادب کی محفلوں میں بیٹھتے، چوپالوں میں جا جا کر قلوبِ زندہ کی تلاش کرتے، درس گاہوں میں پہنچ کر طلبہ کی نوخیز روحوں تک خدا اور رسولؐ کی تعلیم کی خوشبو پہنچاتے۔ مہاجرینِ افغانستان کے لیے چندہ جمع کرنے پر ہر روز کچھ وقت صرف کرتے، لوگوں کو افغانستان میں روسی جارحیت کا حال بتاتے اور انہیں اشتراکیت کے انسانیت کش فلسفے اور اس کی خونم خون تاریخ کے اوراق دکھاتے، روس والوں نے وسط ایشیا کی جن ریاستوں کو پہلے کئی کئی سال تک مسلمانوں کی مزاحمت کو کچلنے کے بعد نخچیر بنایا ہے ان کا دکھڑا بیان کرتے، جبری الحاد کی بھاری چٹان کے نیچے جس طرح اسلامی عقیدوں اور روایتوں کی رائے وبل کو دبا دیا گیا۔ اس کی داستان عام کرتے۔ تم لوگوں میں اسلامی جذبۂ جہاد کو بیدار کرنے کے لیے مارے مارے پھرتے۔ اور نہیں تو گھر پہ درسِ قرآن کا مختصر سا حلقہ شروع کر دیتے، بچوں کو قرآنِ ناظرہ پڑھاتے اور نماز سکھانے کا انتظام کرتے۔ عورتوں کے لیے سلائی کڑھائی کی تربیت کا معیاری نہیں تو غیر رسمی مرکز اہل خانہ کے تعاون سے کھلوا لیتے۔ اپنی بیٹھک پر ان پڑھ عوام کے لیے دفتری کاموں سے متعلق درخواستیں لکھ کر دینے کا انتظام کرتے، محلے والوں سے رابطہ بڑھا کر ایک فلاح کمیٹی قائم کر لیتے اور اس کے زیرِ انتظام نوجوانوں کو کم سے کم ہفتے میں ایک بار جمع کر کے محلے میں اور خصوصاً شہر کی مسجد میں صفائی کی مہم چلاتے، مریضوں کو ہسپتالوں میں اور طلبہ کو درسگاہوں میں داخل دلوانے کے لیے سعی کرتے۔ ان کاموں کے ساتھ ساتھ دینی دعوت کا سلسلہ از خود جاری رہتا۔ ان راستوں پہ چلتے ہوئے نئے نئے ساتھی اکٹھے ہوتے اور ایک محدود سی سماجی اجتماعیت کا حلقہ بن جاتا۔ ایسے چھوٹے چھوٹے ہزاروں حلقے ملک کے شہروں اور دیہات میں ابھر آتے اور ان کی دعوتی سرگرمی کی زد سے کوئی شہری محفوظ نہ رہ سکتا۔

مگر عزیزم! تم اس بات کے عادی ہو گئے ہو کہ لکھے لکھائے پمفلٹ آ جائیں تو ادھر ادھر چند لوگوں کو بھجوا دو، یا پوسٹر تیار ہو کر از خود سامنے آ جائیں تو انہیں دیواروں پہ چسپاں کرا دو، یا ماحول کے جائزے اور کارکردگی کی کوئی رپورٹ دفتر یا گھر میں بیٹھ کر خوش اسلوبی سے مرتب کر دکھاؤ، کوئی مامور شدہ ذمہ دار آ جائے تو اس کے ساتھ باتیں ہو جائیں اور کسی محفل آرائی کی ضرورت ہو تو اس کا بندوبست کر لیا جائے۔

سچا داعی تو وہ ہوتا ہے جس کے اپنے اندر پمفلٹ بھی موجود رہتے ہیں اور پوسٹر بھی، وہ خود

اپنے آپ کو ڈیوٹی پر مامور اور ذمہ دار سمجھتا ہے، وہ ہر روز اپنی رپورٹ اپنے ضمیر کے واسطے سے خدا تک پہنچاتا ہے۔ اور وہ اپنی محفل خود آراستہ کر لیتا ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں وہ کام کرنے کی راہیں خود ایجاد کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خود ہی اُکساتا ہے اور از خود حرکت کرتا ہے۔ اصول اور مقاصد متعین ہیں، دین کا معلمانہ انداز کارہبی واضح ہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد کو حق کا شعور دلانا ہے۔ دینی لٹریچر کا ایک ذخیرہ بصیرت کی روشنی پانے کے لیے موجود ہے، ہر قسم کے حالات میں کام کرنے کے مختلف تجربوں کا سرمایہ ساتھ ہے، مخالف نظریات اور اداروں اور تحریکوں سے تعارف حاصل ہے، فتنوں کا اندازہ ہے تو پھر ایک سچے داعی کو اگر اسکیمو لینڈ میں بھی اُتار دیا جائے تو وہ کام کرنے کا راستہ نکال لے گا۔

ضرورت باہر سے کسی چیز کی اُتنی نہیں ہے، جتنی اندرون کو زندہ و منور کرنے کی ہے۔

رفیقِ عزیز! کہیں ایسا تو نہیں کہ خود تمہاری شخصیت کے شاخسار میں ناکارگی اور سہل انگاری نے آشیانے بنا لیے ہوں، خود تمہارے اندر جذبۂ بیتاب موجود نہ ہو، خود تمہارا ایمان تمہیں پوری طرح روشنی نہ دیتا ہو، خود تمہارا ضمیر افیون خوردہ ہو، خود تم نے زندگی میں بہت سے نمایاں قسم کے تضاد پال لیے ہوں اور ہر قسم کے حالات اور عناصر کے ساتھ تم نے سمجھوتے کر لیے ہوں؟

تمہارا حال اگر خدانخواستہ اس پیراک کا سا ہو جس نے جسم کے ساتھ بھاری پتھر باندھ رکھے ہوں اور ہاتھوں اور پیروں کو زنجیروں سے جکڑ رکھا ہو تو پھر کوئی مودودیؒ، کوئی سید قطبؒ اور کوئی خمینی یا کوئی نظام جماعت تمہیں ڈوبنے سے بچا نہیں سکتا۔ لیکن ستم ظریفی ہوگی، اگر تم نیچے ہی نیچے جاتے ہوئے اپنی تدریجی غرقابی کا الزام دوسروں پر رکھو۔

قومیں اور تحریکیں اور جماعتیں وہی کامیاب ہوتی ہیں جن کا ہر فرد سب سے پہلے اپنی جگہ یہ سوچتا ہے کہ میرا فرض کیا ہے، اور آیا میں اپنا فرض پورا کر رہا ہوں؟ مجھے انقلابِ فردا کے لیے اپنا جو حصّہ ادا کرنا ہے وہ دیانت داری سے ادا کر رہا ہوں؟ جہاں فرد فرد کے اندر ذاتی ذمہ داری کا یہ احساس موجود ہوتا ہے، وہاں یہ ضرورت نہیں پڑتی کہ آدمی اپنی کوتاہیوں کا بوجھ اُٹھا اُٹھا کر دوسروں پر ڈالے اور اس تلاش میں رہے کہ کس کس پر کتنا کتنا یہ بوجھ ڈالا جا سکتا ہے۔ (باقی بر صفحہ ۷۶)

(گذشتہ سے پیوستہ)

تذکرۂ انبیاء
علیہم السلام

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

باب اوّل ——— قصۂ آدم علیہ السلام

فصل ۹

فصل ۹

ابلیس اور اس کا کردار

حقیقتِ ابلیس

ابلیس کا لفظی ترجمہ ہے "انتہائی مایوس"۔ اصطلاحاً یہ اس جن کا نام ہے جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کر کے آدمؑ اور بنی آدم کے لیے مطیع و مسخر ہونے سے انکار کر دیا اور اللہ سے قیامت تک کے لیے مہلت مانگی کہ اسے نسلِ انسانی کو بہکانے اور گمراہیوں کی طرف ترغیب دینے کا موقع دیا جائے۔ اسی کو "شیطان" بھی کہا جاتا ہے۔ درحقیقت شیطان اور ابلیس بھی محض کسی مجرد قوت کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ انسان کی طرح ایک صاحبِ تشخص ہستی ہے۔ نیز کسی کو یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہیے کہ یہ فرشتوں میں سے تھا۔ قرآن نے سورۂ کہف، آیت ۵۰ میں خود تصریح کر دی ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا جو فرشتوں سے الگ، مخلوقات کی ایک مستقل صنف ہیں۔

غالباً ابلیس سجدے سے انکار کرنے میں اکیلا نہ تھا، بلکہ جنوں کی ایک جماعت نافرمانی پر آمادہ ہو گئی تھی، اور ابلیس کا نام صرف اس لیے لیا گیا ہے کہ وہ ان کا سردار اور اس بغاوت میں پیش پیش تھا۔ لیکن اس آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کافروں میں سے تھا۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جنوں کی ایک جماعت پہلے سے ایسی موجود تھی جو سرکش و نافرمان تھی، اور ابلیس کا تعلق اسی جماعت سے تھا۔ قرآن میں بالعموم "شیاطین" کا لفظ انہی جنوں اور ان کی ذریت (نسل) کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اور جہاں شیاطین سے انسان مراد لینے کا کوئی قرینہ نہ ہو وہاں یہی شیاطین جن مراد ہوتے ہیں۔

قصۂ آدمؑ میں ابلیس کا ذکر

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا	اور یاد کرو جب کہ ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو
لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ	سجدہ کرو، مگر ابلیس نے نہ کیا۔ اس نے کہا کیا

ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۝	میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؟"
قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ	پھر وہ بولا "دیکھ تو سہی، کیا یہ اس قابل تھا کہ
كَرَّمْتَ عَلَيَّ ز لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى	تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی؟ اگر تو مجھے قیامت
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ	کے دن تک مہلت دے تو میں اس کی پوری نسل کی
اِلَّا قَلِيْلًا ۝ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ	بیخ کنی کر ڈالوں، بس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ
تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ	سکیں گے۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا، "اچھا تو جا، ان
جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ۝ وَاسْتَفْزِزْ	میں سے جو بھی تیری پیروی کریں، تجھ سمیت ان سب
مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ	کے لیے جہنم ہی بھرپور جزا ہے۔ تو جس جس کو
اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ	اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے پھسلا لے، ان
وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ	پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا، مال اور اولاد
وَعِدْهُمْ ط وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ	میں ان کے ساتھ ساجھا لگا، اور ان کو وعدوں
اِلَّا غُرُوْرًا ۝	کے جال میں پھانس ۔۔ اور شیطان کے وعدے
(بنی اسرائیل - آیات: ۶۱ تا ۶۴)	ایک دھوکے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔
وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ	جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی
بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ	سے ایک بشر بنانے والا ہوں، پھر جب میں اسے
وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا	پوری طرح بنا دوں، اور اس میں اپنی روح پھونک
لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ فَسَجَدَ	دوں، تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ۔ اس
الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ	حکم کے مطابق فرشتے سب کے سب سجدے میں گر گئے
اِبْلِيْسَ ط اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ	مگر ابلیس نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ
الْكٰفِرِيْنَ ۝	کافروں سے ہو گیا۔
قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ	رب نے فرمایا "اے ابلیس تجھے کیا چیز اس کو
اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ط	سجدہ کرنے سے مانع ہوئی جسے میں نے اپنے ہاتھوں
اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ	سے بنایا ہے؟ تو بڑا بن رہا ہے یا ہے ہی کچھ اونچے

الْعَالِينَ ۝ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۖ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۝ وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ۝

درجے کی ہستیوں میں سے ؟" اس نے جواب دیا "میں اس سے بہتر ہوں۔ آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے۔" فرمایا "اچھا تو یہاں سے نکل جا، تو مردود ہے، اور تیرے اوپر یوم الجزا تک میری لعنت ہے۔"

قَالَ رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ۝ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ۝ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝

وہ بولا "اے میرے رب، یہ بات ہے تو پھر مجھے اس روز تک مہلت دے دے جب یہ لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔" فرمایا "اچھا، تجھے اس روز تک مہلت ہے جس کا وقت مجھے معلوم ہے۔" اس نے کہا "تیری عزت کی قسم، میں ان سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا، بجز تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہے۔"

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ۝ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَمِمَّن تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ۝

فرمایا "تو حق یہ ہے، اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں، کہ میں جہنم کو تجھ سے اور ان سب لوگوں سے بھر دوں گا، جو ان انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے۔"

(ص۔ آیات ۷۱ تا ۸۵)

گزشتہ آیات سے متعلق چند اشارات

۱۔ یہ قصہ دراصل یہ بات ذہن نشین کرنے کے لیے بیان کیا جا رہا ہے کہ اللہ کے مقابلے میں ان کافروں کا یہ تمرد، اور تنبیہات سے ان کی یہ بے اعتنائی، اور کجروی پر ان کا یہ اصرار ٹھیک ٹھیک اس شیطان کی پیروی ہے جو ازل سے انسان کا دشمن ہے، اور اس روش کو اختیار کر کے درحقیقت یہ لوگ اس جال میں پھنس رہے ہیں جس میں اولادِ آدم کو پھانس کر تباہ کر دینے کے لیے شیطان نے آغازِ تاریخِ انسانی میں چیلنج کیا تھا۔

۲۔ شیطان نے چیلنج کیا تھا کہ میں ان کے قدم راستی کی راہ سے اکھاڑ پھینکوں گا۔ چونکہ انسان کا اصل مقام خلافتِ الٰہی ہے جس کا تقاضا اطاعت میں ثابت قدم رہنا ہے، اس لیے اس مقام سے اس کا ہٹ جانا

بالکل ایسا ہے جیسے کسی درخت کا بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جانا۔

۳۔ آیت میں شیطان کو اس ڈاکو سے تشبیہ دی گئی ہے جو کسی بستی پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لائے اور ان کو اشارہ کرتا جائے کہ اِدھر لوٹو، اُدھر چھاپہ مارو، اور وہاں غارتگری کرو۔ شیطان کے سواروں اور پیادوں سے مراد وہ سب جن اور انسان ہیں جو بے شمار مختلف شکلوں اور حیثیتوں میں ابلیس کے مشن کی خدمت کر رہے ہیں۔

۴۔ آیت نمبر ۶۴ میں شیطان اور اس کے پیرؤوں کے باہمی تعلق کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ جو شخص مال کمانے اور اس کو خرچ کرنے میں شیطان کے اشاروں پر چلتا ہے، اس کے ساتھ گویا شیطان مفت کا شریک بنا ہوا ہے۔ محنت میں اس کا کوئی حصہ نہیں، جرم اور گناہ اور غلط کاری کے بُرے نتائج میں وہ حصہ دار نہیں، مگر اس کے اشاروں پر یہ بے وقوف اس طرح چل رہا ہے جیسے اس کے کاروبار میں وہ برابر کا شریک، بلکہ شریکِ غالب ہے۔ اس طرح اولاد تو آدمی کی اپنی ہوتی ہیں، اور اُسے پالنے پوسنے میں سارے پاپڑ آدمی خود بیلتا ہے، مگر شیطان کے اشاروں پر وہ اس اولاد کو گمراہی اور بداخلاقی کی تربیت اس طرح دیتا ہے، گویا اس اولاد کا تنہا وہی باپ نہیں ہے بلکہ شیطان بھی باپ ہونے میں اس کا شریک ہے۔

۵۔ ابلیس روزِ اوّلِ آفرینش سے اولادِ آدم کے پیچھے پڑا ہوا ہے تاکہ اس کو آرزوؤں اور تمناؤں اور جھوٹے وعدوں کے دام میں پھانس کر راہِ راست سے ہٹالے جائے اور یہ ثابت کردے کہ وہ اس بزرگی کا مستحق نہیں ہے جو اسے خدا نے عطا کی ہے۔ اس خطرے سے اگر کوئی چیز انسان کو بچا سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ انسان اپنے رب کی بندگی پر ثابت قدم رہے اور ہدایت و اعانت کے لیے اُسی کی طرف رجوع کرے اور اسی کو اپنا وکیل (مدارِ توکل) بنائے۔ اس کے سوا دوسری جو راہ بھی انسان اختیار کرے گا، شیطان کے پھندوں سے نہ بچ سکے گا۔

۶۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ کے دو مطلب ہیں، اور دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ میرے بندوں، یعنی انسانوں پر تجھے یہ اقتدار حاصل نہ ہوگا کہ تو انھیں زبردستی اپنی راہ پر کھینچ لے جائے تو فقط بہکانے اور پھسلانے اور غلط مشورے دینے اور جھوٹے وعدے کرنے کا مجاز کیا جاتا ہے، مگر تیری بات کو قبول کرنا یا نہ کرنا ان بندوں کا اپنا کام ہوگا۔ تیرا ایسا تسلط ان پر نہ ہوگا کہ وہ تیری راہ پر جانا چاہیں یا نہ چاہیں، بہرحال تو ہاتھ پکڑ کر ان کو گھسیٹ لے جائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ میرے خالص بندوں، یعنی صالحین پر تیرا

بس نہ چلے گا۔ کمزور اور ضعیف الارادہ لوگ تو ضرور تیرے وعدوں سے دھوکا کھائیں گے، مگر جو لوگ میری بندگی پر ثابت قدم ہوں، وہ تیرے قابو میں نہ آسکیں گے۔

یعنی جو لوگ اللہ پر اعتماد کریں، اور جن کا بھروسا اسی کی رہنمائی اور توفیق اور مدد پر ہو، ان کا بھروسہ ہرگز غلط ثابت نہ ہوگا۔ انھیں کسی اور دوسرے سہارے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اللہ ان کی ہدایت کے لیے بھی کافی ہوگا اور ان کی دست گیری و اعانت کے لیے بھی۔ البتہ جن کا بھروسا اپنی طاقت پر ہو، یا اللہ کے سوا کسی اور پر ہو، وہ اس آزمائش سے بخیریت نہ گزر سکیں گے۔

حکم سجدہ اور انکارِ شیطان کی بحث

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا
لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ
أَبَىٰ ۝ فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَٰذَا
عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا
يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ ۝
إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا
تَعْرَىٰ ۝ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ
فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ۝ فَوَسْوَسَ
إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ
هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ
وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ ۝ فَأَكَلَا مِنْهَا
فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا
يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ
وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ۝
ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ
عَلَيْهِ وَهَدَىٰ ۝ قَالَ

اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو، وہ تو سب سجدہ کر گئے۔ مگر ابلیس تھا کہ انکار کر بیٹھا۔ اس پر ہم نے آدم سے کہا: کہ یہ تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ تمھیں جنت سے نکلوا دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہاں تو تمھیں آسائشیں حاصل ہیں کہ نہ بھوکے ننگے رہتے ہو، نہ پیاس اور دھوپ تمھیں ستاتی ہے۔" لیکن شیطان نے اسے پھسلایا۔ کہنے لگا آدم! بتاؤں تمھیں وہ درخت جس سے ابدی زندگی اور لازوال سلطنت حاصل ہوتی ہے؟ آخر کار دونوں (میاں بیوی) اس درخت کا پھل کھا گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً ہی ان کے ستر ایک دوسرے کے آگے کھل گئے اور لگے دونوں اپنے آپ کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے۔ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہِ راست سے بھٹک گیا۔ پھر اس کے رب نے اسے برگزیدہ کیا اور اس کی توبہ قبول کی اور اسے ہدایت بخشی، اور

اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا ۢ	فرمایا تم دونوں فریق (یعنی انسان اور شیطان) یہاں
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَإِمَّا	سے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے
يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى	اب اگر میری طرف سے تمھیں کوئی ہدایت پہنچے تو
فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ	جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ
وَلَا يَشْقَىٰ ۝ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن	بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا۔ اور جو میرے "ذکر"
ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً	(درس نصیحت) سے منہ موڑے گا اس کے لیے
ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ	دنیا میں زندگی تنگ ہوگی اور قیامت کے روز ہم
أَعْمَىٰ ۝ (طٰہٰ۔ آیات ۱۲۳ تا ۱۲۴)	اسے اندھا اٹھائیں گے۔

ابلیس نے سجدہ کیوں نہ کیا

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا	یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو
لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ	سجدہ کرو۔ انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا۔
مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ	وہ جنوں میں سے تھا۔ اس لیے اپنے رب کے حکم
(الکہف - آیت ۵۰)	کی اطاعت سے نکل گیا۔

ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا بلکہ جنوں میں سے تھا۔ اسی لیے اطاعت سے باہر ہو جانا اس کے لیے ممکن ہوا۔ فرشتوں کے متعلق قرآن تصریح کرتا ہے کہ وہ فطرتاً مطیع فرمان ہیں۔ (اللہ جو حکم ان کو دے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے) بخلاف اس کے جن انسانوں کی طرح ایک ذی اختیار مخلوق ہے۔ جسے پیدائشی فرمانبردار نہیں بنایا گیا بلکہ کفر و ایمان اور طاعت و معصیت، دونوں کی قدرت بخشی گئی ہے۔ اس حقیقت کو یہاں کھولا گیا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے تھا، اس لیے اس نے خود اپنے اختیار سے فسق کی راہ انتخاب کی۔ یہ تصریح ان تمام غلط فہمیوں کو رفع کر دیتی ہے جو عموماً لوگوں میں پائی جاتی ہیں کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا، اور فرشتہ بھی کوئی معمولی نہیں بلکہ معلم الملکوت۔

رہا یہ سوال کہ جب ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا۔ تو پھر قرآن کا یہ طرزِ بیان کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ہم نے ملائکہ کو کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، پس ان سب نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فرشتوں کو سجدے کا حکم دینے کے معنی یہ تھے کہ وہ تمام مخلوقاتِ ارضی بھی انسان کی مطیع فرمان بن جائیں۔

جو کرۂ زمین کی عملداری میں فرشتوں کے زیرِ انتظام آباد ہیں۔ چنانچہ فرشتوں کے ساتھ یہ سب مخلوقات بھی سربسجود ہوگئیں۔ مگر ابلیس نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

شیطان کا اصل ہدف حضرت آدمؑ تھے

یہاں قرآن صاف تصریح کرتا ہے کہ آدم و حوا میں سے اصل وہ شخص جس کو شیطان نے وسوسے میں ڈالا، آدمؑ تھے، نہ کہ حضرت حوا۔ اگرچہ سورۂ اعراف کے بیان کے مطابق مخاطب دونوں ہی تھے اور بہکانے میں دونوں ہی آئے، لیکن شیطان کی وسوسہ اندازی کا رخ دراصل حضرت آدمؑ ہی کی طرف تھا۔ اس کے برعکس، بائیبل کا بیان یہ ہے "کہ سانپ نے پہلے عورت سے بات کی اور پھر عورت نے شوہر کو بہکا کر درخت کا پھل اسے کھلایا۔" (پیدائش، باب ۳) (ط ج ۳ حاشیہ ۹۹)

سورۂ اعراف میں شیطان کی گفتگو کی مزید تفصیل ہم کو یہ ملتی ہے، کہ اس نے کہا: کہ "تمہارے رب نے تم کو اس درخت سے صرف اس لیے روک دیا ہے کہ کہیں تم دونوں فرشتے نہ ہو جاؤ یا ہمیشہ جیتے نہ ہو۔" آیت ۲۰۔ (۷۷)

انسان اور شیطان کی باہمی رقابت و عداوت

انسان کا دشمن شیطان اور شیطان کا دشمن انسان۔ شیطان کا دشمنِ انسان ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ اسے اللہ کی فرمانبرداری کے راستے سے ہٹانے اور تباہی میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ رہا انسان کا دشمنِ شیطان ہونا، تو فی الواقع انسانیت تو اس سے دشمنی ہی کی مقتضی ہے، مگر خواہشاتِ نفس کے لیے جو ترغیبات وہ پیش کرتا ہے، ان سے دھوکا کھا کر آدمی اسے اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ اس طرح کی دوستی کے معنی یہ نہیں کہ حقیقتہً دشمنی دوستی میں تبدیل ہوگئی، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک دشمن دوسرے دشمن سے شکست کھا گیا اور اس کے جال میں پھنس گیا۔

شیطان کی طرف سے انسانوں کو بہکانے کا چیلنج

چیلنج یہ تھا کہ جس طرح تو نے اس حقیر اور کم تر مخلوق کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر مجھے مجبور کر دیا ہے کہ تیرا حکم نہ مانوں، اب میں ان انسانوں کے لیے دنیا کو ایسا دلفریب بنا دوں گا کہ یہ سب اس سے دھوکا کھا کر تیرے نافرمان بن جائیں گے۔ بالفاظ دیگر ابلیس کا مطلب یہ تھا ——— کہ میں زمین کی زندگی اور اس کی لذتوں کو اور اس کے عارضی فوائد و منافع کو انسانوں کے لیے ایسا خوشنما بنا دوں گا کہ وہ خلافت اور اس کی ذمہ داریوں اور آخرت کی بازپرس کو بھول جائیں گے، اور خود تجھے بھی یا تو فراموش

کردیں گے، یا تجھے یاد رکھنے کے باوجود تیرے احکام کی خلاف ورزیاں کریں گے۔

میرے بندوں پر تیرا بس نہ چلے گا

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝
(بنی اسرائیل۔ آیت ۶۵)

"یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا اور توکل کے لیے تیرا رب کافی ہے۔"

اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ کہ میرے بندوں (یعنی عام انسانوں) پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا کہ تو انھیں زبردستی نافرمان بنا دے۔ البتہ جو خود ہی بہکے ہوئے ہوں اور آپ ہی تیری پیروی کرنا چاہیں، انھیں تیری راہ پر چلنے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا، انھیں ہم زبردستی اس سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں گے۔

پہلے معنی کے لحاظ سے مضمون کا خلاصہ یہ ہوگا کہ بندگی کا طریقہ اللہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے۔ جو لوگ اس راستے کو اختیار کر لیں گے۔ ان پر شیطان کا بس نہ چلے گا، انھیں اللہ اپنے لیے خالص فرمائے گا۔ اور شیطان خود بھی اقراری ہے کہ وہ اس کے پھندے میں نہ پھنسیں گے۔ البتہ جو لوگ خود بندگی سے منحرف ہو کر اپنی فلاح و سعادت کی راہ گم کر دیں گے وہ ابلیس کے ہتھے چڑھ جائیں گے، اور جدھر جدھر وہ انھیں فریب دے کر لے جانا چاہے گا وہ اس کے پیچھے بھٹکتے اور دور سے دور نکلتے چلے جائیں گے۔

دوسرے معنی کے لحاظ سے اس بیان کا خلاصہ یہ ہوگا۔ شیطان نے انسانوں کو بہکانے کے لیے اپنا طریق کار یہ بیان کیا کہ وہ زمین کی زندگی کو ان کے لیے خوشنما بنا کر انھیں خدا سے غافل اور بندگی کی راہ سے منحرف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ یہ شرطیں نے مانی۔ اور مزید توضیح کرتے ہوئے یہ بات بھی صاف کر دی کہ تجھے صرف فریب دینے کا اختیار دیا جا رہا ہے، یہ اقتدار نہیں دیا جا رہا کہ تو ہاتھ پکڑ کر انھیں زبردستی اپنی راہ پر کھینچ لے جائے۔ شیطان نے اپنے نوٹس سے ان بندوں کو مستثنیٰ کیا جنھیں اللہ اپنے لیے خالص فرمالے۔ اس سے یہ غلط فہمی مترشح ہو رہی تھی کہ شاید اللہ تعالیٰ بغیر کسی معقول وجہ کے یونہی جس کو چاہے گا خالص کر لے گا اور وہ شیطان کی دسترس سے بچ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر بات صاف کر دی کہ جو خود بہکا ہوا ہوگا وہ تیری پیروی کرے گا۔ بالفاظِ دگر جو بہکا ہوا نہ ہوگا وہی ہمارا مخصوص بندہ ہوگا، جسے ہم خالص اپنا کر لیں گے۔

شیطان کو بندوں پر زبردستی کرنے کا اختیار نہیں

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ	بولا، اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں
صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ	مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں
مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ	کی گھات میں لگا رہوں گا، آگے اور پیچھے، دائیں
وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا	اور بائیں، ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو
تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۔ (الاعراف ۱۶-۱۷)	ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔

یہ وہ چیلنج تھا جو ابلیس نے خدا کو دیا۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ مہلت جو آپ نے مجھے قیامت تک کے لیے دی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر میں یہ ثابت کرنے کے لیے پورا زور صرف کروں گا کہ انسان اس فضیلت کا مستحق نہیں ہے جو آپ نے میرے مقابلہ میں اسے عطا کی ہے۔ میں آپ کو دکھا دوں گا کہ یہ کیسا ناشکرا، کیسا نمک حرام اور کیسا احسان فراموش ہے۔

یہ مہلت جو شیطان نے مانگی اور خدا نے اسے عطا فرما دی، اس سے مراد محض وقت ہی نہیں ہے بلکہ اس کام کا موقع دینا بھی ہے جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ یعنی اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے انسان کو بہکانے اور اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اس کی نااہلی ثابت کرنے کا موقع دیا جائے، اور یہ موقع اللہ تعالیٰ نے اسے دے دیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل آیات ۶۱ - ۶۵ میں اس کی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اختیار دے دیا کہ آدم اور اس کی اولاد کو راہِ راست سے ہٹا دینے کے لیے جو چالیں وہ چلنا چاہتا ہے، چلے۔ ان چال بازیوں سے اسے روکا نہیں جائے گا بلکہ وہ سب راہیں کھلی رہیں گی جن سے وہ انسان کو فتنہ میں ڈالنا چاہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ شرط لگا دی کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۔ یعنی "میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار نہ ہوگا"۔ تو صرف اس بات کا مجاز ہوگا کہ ان کو غلط فہمیوں میں ڈالے، جھوٹی امیدیں دلائے، بدی اور گمراہی کو ان کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کرے۔ لذتوں اور فائدوں کے سبز باغ دکھا کر ان کو غلط راستوں کی طرف دعوت دے۔ مگر یہ طاقت تجھے نہیں دی جائے گی کہ انھیں ہاتھ پکڑ کر زبردستی کھینچ لے جائے۔ اور اگر وہ خود راہِ راست پر چلنا چاہیں تو اُنھیں تو نہ چلنے دے۔ یہی بات سورۂ ابراہیم میں بھی رکوع ۴ میں فرمائی گئی ہے کہ قیامت میں عدالتِ الٰہی سے فیصلہ صادر ہو جانے کے بعد شیطان اپنے پیرو انسانوں سے کہے گا۔

"میرا تم پر کوئی زور تو نہ تھا کہ میں نے اپنی پیروی پر تمھیں مجبور کیا ہو، میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ

تمھیں اپنی راہ پر بلایا اور تم نے میری دعوت قبول کرلی ۔ لہٰذا اب مجھے ملامت نہ کرو، بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔"

شیطان اپنی معصیت کی ذمہ داری خدا پر ڈالتا ہے

اور یہ جو شیطان نے خدا پر الزام عائد کیا ہے کہ تو نے ۔ مجھے گمراہی میں مبتلا کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اپنی معصیت کی ذمہ داری خدا پر ڈالتا ہے ۔ اس کو شکایت ہے کہ آدم کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے کر تو نے مجھے فتنے میں ڈالا، اور میرے نفس کے تکبر کو ٹھیس لگا کر مجھے اس حالت میں مبتلا کر دیا ۔ کہ میں نے تیری نافرمانی کی ۔ گویا اس احمق کی خواہش یہ تھی کہ اس کے نفس کی چوری پکڑی نہ جاتی، بلکہ جس پندارِ غلط، اور جس سرکشی کو اس نے اپنے اندر چھپا رکھا تھا اس پر پردہ پڑا رہنے دیا جاتا ۔ یہ ایک کھلی ہوئی سفیہانہ بات تھی جس کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا ۔

شیطان کی مردودیت

اصل میں لفظ "رجیم" استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنی ہیں ۔ "پھینکا ہوا" یا "مارا ہوا" اور محاورے میں یہ لفظ اس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جسے مقامِ عزت سے گرا دیا گیا ہو اور ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا گیا ہو ۔ یوم الجزاء تک تو وہ اپنی نافرمانی کی پاداش میں مبتلائے لعنت رہے گا اور یوم الجزاء کے بعد وہ اپنے کرتوتوں کی سزا بھگتے گا جو تخلیقِ آدم کے وقت سے لے کر قیامت تک اس سے سرزد ہوں گے ۔

(باقی)

محدثِ قرطبہ بقیؒ بن مخلد رحمۃ اللہ علیہ

جناب طیب شاہین صاحب

(۳)

امام بقی بن مخلد کی مخالفت کرنے والوں میں مندرجہ ذیل اصحاب زیادہ مشہور ہیں:-

۱ عبد اللہ بن خالد :- خود بھی عالم حدیث تھے اور ا سے بے شمار فقہی مسائل حفظ تھے۔

۲ ابو عبد اللہ محمد بن حارث بن ابی سعید :- ابو عبد اللہ قرطبہ کے عماء میں شمار ہوتے تھے۔ اپنے والد اور جناب یحیٰی بن یحیٰی سے علم حاصل کیا۔ انہوں نے حج کیا اور وہاں کے علماء سے بھی استفادہ کیا۔ امیر عبد الرحمٰن الاوسط نے انہیں پولیس کے معاملات کا سربراہ مقرر کیا۔ عبد الرحمٰن کے بعد امیر محمد بن عبد الرحمٰن نے بھی انہیں اس عہدے پر بحال رکھا اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں والیٔ سوق بھی مقرر کیا۔ یہ دونوں عہدے تا زندگی اُن کے پاس رہے۔ یہ امام بقی کی مخالفت کرنے میں پیش پیش تھے۔ ۲۶۰ھ میں وفات پائی۔

۳ - ابو زید عبد الرحمٰن بن ابراھیم بن عیسی :- ابو زید کا جدّ اعلیٰ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا آزاد کردہ غلام تھا۔ ابو زید بنی ابی زبد کا مورثِ اعلیٰ ہے۔ امیر عبد الرحمٰن کے زمانے میں اس نے بلادِ مشرق کا سفر بھی کیا۔ اِس کا علمِ حدیث وسیع تھا۔ لیکن اس پر امام مالکؒ کی فقہ غالب تھی۔ شوریٰ میں اسے ہمیشہ مقدم رکھا جاتا تھا۔ اور اس کا فتویٰ بہت اہمیت رکھتا تھا۔ ۲۵۸ھ میں فوت ہوا۔

جب امام بقی بن مخلدؒ نے مصنف ابن ابی شیبہؒ کا درس دینا شروع کیا اور مسائل میں امام مالکؒ کے ساتھ دوسرے علماء کے اختلافات بیان کرنے شروع کیے اور امام مالک اصحاب امام مالکؒ کی آراء کا دیگر مجتہدین کی آراء کے ساتھ موازنہ شروع کیا تو مالکی فقہا نے واویلا مچا کر عوام کو بھڑکا دیا جس پر عوام بقی بن مخلدؒ کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کو تدریسِ حدیث سے روک دیا۔ آخر کار معاملہ امیر محمد بن عبدالرحمٰن تک جا پہنچا۔ امیر محمد بن عبدالرحمٰن خود بھی عالم تھا۔ اور علم دوست شخص تھا۔ اُس نے امام بقی بن مخلد اور مالکی فقہا کو دربار میں طلب کیا۔ پھر اُس نے مصنف ابن ابی شیبہؒ کو اول تا آخر دیکھا۔ نہ صرف یہ کہ اسے اس کتاب میں کوئی قابلِ اعتراض چیز نظر نہیں آئی بلکہ وہ کتاب کی جامعیت اور اُس کے حسنِ ترتیب سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اپنے کتب خانہ کے ناظم کو حکم دیا کہ وہ اس کتاب کا نسخہ نقل کر کے کتب خانہ میں رکھ دے۔ پھر اُس نے امام بقی بن مخلدؒ سے کہا کہ وہ بے خوف و خطر اپنے مشن کو جاری رکھیں۔ اور اپنے علم کو پھیلائیں۔ مخالفت کرنے والے فقہا کو امام بقی بن مخلد کے معاملہ میں مداخلت کرنے سے سختی سے منع کر دیا۔[1]

"دائرہ معارفِ اسلامی اردو" میں مرقوم ہے کہ فکری اختلافات اور رقابت کی بنا پر اُن کے لیے سزائے موت تجویز ہوئی۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں جو مآخذ میسر ہیں اُن سے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ موت کی سزا دینے کے لیے انہوں نے کیا فردِ جرم عائد کی تھی۔ معاصرت کی بنا پر حسد و رقابت ہمیشہ سے علمائے سوء کا شیوہ رہا ہے۔ ہر زمانے میں علمائے حق نے علم کے ان ٹھیکیداروں کے طعن و تشنیع کے تیر کھائے ہیں۔ ان کی فتنہ سامانیوں کی وجہ سے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ ان کو کوڑے لگائے گئے۔ اُن کو سرِ عام رسوا کیا گیا ہے یہاں تک کہ انہیں تختۂ دار پہ لٹکایا گیا۔ ہر زمانے میں اہلِ اقتدار نے ان علمائے سوء کی یہ کھیل کھیلنے میں بھرپور مدد کی۔ ان نام نہاد علماء اور مفتیوں نے فتووں کی ٹکسال میں فتوے گھڑے۔ ہمیشہ سے اُن کی نظر میں اہلِ دانش صرف وہی لوگ ہیں جنہوں نے اُن کے مدارس میں تعلیم پائی ہے۔ قرآن و سنت کا فہم صرف وہی علماء رکھتے ہیں جنہوں نے اُن سے سندِ علم لی ہے۔ تفقہ کے حامل

---

[1] نفح الطیب۔ جلد ۹ ص ۲۸۸

صرف وہی ہیں جو اُن کے مشائخ کے قصیدے پڑھتے ہیں ۔ اُن کے ساتھ معمولی سا بھی اختلاف رکھنے والا علم و تقوٰی اور دانش و تفقہ کے کم سے کم معیار سے بھی گر جاتا ہے ۔ تب کسی عدالت میں اس پر فردِ جرم عاید ہو جاتی ہے ۔ فتوؤں کی ٹیکسال میں اُس کے خلاف فتوے گھڑ لیے جاتے ہیں ۔ پھر اُس کے لیے صلیب تیار ہو جاتی ہے یا اُس کے لیے زہر کا پیالہ بھر دیا جاتا ہے ۔

امام بقی بن مخلد رحمۃ اللہ علیہ نے مشرق سے واپس آ کر جب اپنی مسند مدوّن کرنا شروع کی تو بعض حضرات[1] نے محض تعصب کی بنا پر جناب بقی رح کے ساتھ عداوت رکھنے پر کمر باندھ لی کہ انہوں نے اپنی مسند مرتب کرتے وقت یحیٰی بن یحیٰی کی مرویات کی بجائے ابو مصعب رح اور یحیٰی بن بکیر رح کی مرویات کو مقدم رکھا ہے[2]۔ اس کے بعد ان "اصحابِ علم" نے گویا بقی کی عداوت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ۔ حالانکہ وہ خود بھی یحیٰی بن بکیر رح اور ابو مصعب رح کے علمی مرتبے سے ناواقف نہ تھے ۔ یحیٰی بن بکیر رح صدق و دیانت اور تفقہ کے پہاڑ تھے ۔ مشرق و مغرب کے جلیل القدر علماء نے اُن کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ہے ۔ انہوں نے امام مالک رح سے مؤطا کی سترہ بار سماعت کی ہے[3]۔

یہاں آ کر ہمیں امام بقی بن مخلد رح اور امام الہند امام شاہ ولی اللہ رح میں بہت حد تک مماثلت کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے ۔ ہر چند کہ دونوں حضرات کے زمان و مکان کے احوال میں بہت فرق اور سیاسی تناظر میں بہت اختلاف تھا ۔ لیکن پھر بھی ایک چیز اِن دونوں میں مشترک تھی ۔ امام بقی رح بن مخلد اندلس میں علومِ حدیث اور فقہ اثری کے بانی تھے اور ہند میں علومِ حدیث کو شاہ ولی اللہ رح کے توسط سے فروغ حاصل ہوا اور ہند میں اسلامی نشاۃ ثانیہ اور فقہ اسلامی کی تدوینِ نو کی بنیاد پڑی ۔ اور دونوں حضرات کو سنتِ نبوی کی اشاعت کے سلسلے میں ایک سی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ۔

ان مخالفتوں کے باوجود طلوعِ صبح کو نہ روکا جا سکا ۔ امام بقی بن مخلد کی کوششوں سے اندلس

---

[1] ان حضرات میں امام یحیٰی بن یحیٰی کے دو صاحبزادے عبید اللہ بن یحیٰی اور اسحٰق بن یحیٰی سرِ فہرست ہیں ۔ اس بارے میں یاقوت نے ان اصحاب کے ساتھ امام بقی بن مخلد کا مکالمہ بھی نقل کیا ہے ۔ معجم الادباء جلد ۲ ص ۳۷۰ ۔

[2] معجم الادباء یاقوت حموی جلد ۲ ص ۳۷۰

[3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۴۲۰

دارالحدیث بن گیا۔ قرطبہ کے مدارس میں موطا امام مالکؒ اور فقہ امام مالکؒ کے علاوہ حدیث کا وسیع مطالعہ شروع ہوگیا۔ بقیؒ ایک شمع روشن کر گئے تھے۔ اس شمع سے اور شمعیں روشن ہوتی گئیں اس طرح روشنی بڑھتی گئی۔ اس کے بعد اندلس میں بے شمار اہلِ علم پیدا ہوئے جو آزادیٔ فکر کے حامل اور سنّتِ نبوی کے علوم پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ تمام عالمِ اسلام نے ان کے علم سے خوشہ چینی کی ہے۔ اندلس اگرچہ مٹ گیا اس کی اسلامی تہذیب پیوندِ خاک ہوگئی لیکن اندلس اپنی گرمیٔ افکار کی وجہ سے آج بھی زندہ ہے کتنے ہی علماء ہیں آج جن کے افکار کی روشنی میں ہم اپنی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ ان کے نام اندلس یا قرطبہ سے منسوب ہیں۔

بقی بن مخلد کی تصانیف امام بقیؒ نے جو کتابیں تصنیف کیں وہ ہمارے سامنے نہیں، زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیں۔ تدمیر اندلس کے دوران لاکھوں کی تعداد میں کتابوں کو نذرِ آتش کردیا گیا یا وادی الکبیر میں بہا دیا گیا۔ اندلسی علماء کی بہت سی کتب کے حوالے ہم دوسری کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ لیکن اصل کتابیں اس دنیا سے ناپید ہوچکی ہیں۔ وہ علماء جنہوں نے امام بقی کی کتب کا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے ان کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اور انہی حضرات کی معلومات ہمارے اس تبصرے کا ماخذ ہیں۔ علامہ ابن حزمؒ امام بقیؒ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ انہوں نے امام بقی کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور پھر اپنے تاثرات ثبت کیے ہیں۔ علامہ ابن حزم کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام بقیؒ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں ہیں۔ کتب سوانح میں ان کی صرف تین کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

۱۔ تفسیر بقیؒ بن مخلد

۲۔ مسند بقی بن مخلد

۳۔ صحابہ و تابعین کے فتاوی

تفسیر بقی بن مخلدؒ "کشف الظنون" میں علمِ تفسیر کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔ "تفسیر وہ علم ہے جس میں بشری طاقت کی حد تک عربی زبان کے قواعد کے مطابق نظمِ قرآن کے معنی سے بحث کی جائے۔"[1]

[1] تاریخ افکار و علوم اسلامی۔ علامہ راغب طباخ۔ اردو ترجمہ ادارہ معارف اسلامی کراچی جلد ۱ ص ۱۹۹

قرآن مجید عربی مبین اور عربوں کے اسلوب بلاغت پر نازل ہوا ہے۔ صحابہ کرام جو قرآن کے اوّلین مخاطب تھے۔ وہ اس کے مفردات کے معانی، اس کے محاورے اور اس کے تمام اسالیب کو خوب سمجھتے تھے تاہم جہاں کہیں اشکال واقع ہوتا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کر لیا کرتے تھے۔ کسی آیت کے شانِ نزول، اس کے ناسخ و منسوخ کے متعلق آپ سے پوچھ لیتے تھے۔ اور آپ خود بھی مجمل آیت کی توضیح فرما دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کی تفسیر میں بہت کم اختلاف ملتا ہے۔ صحابہ کرام سے یہ تفسیر تابعین نے اخذ کی اور ان سے تبع تابعین نے حاصل کی اور پھر تفسیر بھی دیگر علوم کی طرح دورِ تدوین میں داخل ہوئی۔ اس سے پہلے محدثین تفسیر، فقہی اور دیگر ملی جلی احادیث روایت کرتے تھے۔ بعض حضرات نے دانستہ یا نادانستہ طور پر نہایت ضعیف بلکہ موضوع تفسیری روایات بھی شامل کرنا شروع کر دیں۔ اس طرح تفسیر میں بظاہر بہت زیادہ اختلاف نظر آنے لگا۔ اس قسم کی روایات بیان کرنے والے زیادہ تر واعظین قصاص اور سورتوں کے فضائل بیان کرنے والے حضرات تھے۔ امام احمدؒ بن حنبل رحمۃ اللہ کے قول "ثلاث کتب لا اصل لها المغازی والملاحم والتفسیر" (تین قسم کی کتابیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں، غزوات، جنگیں اور تفسیر[1]) میں اسی قسم کے واضعین کی طرف اشارہ ہے ورنہ انہوں نے خود بھی تفسیر روایت کی ہے۔ اور دیگر ثقہ محدثین نے بھی تفسیری روایات نقل کی ہیں۔ مندرجہ ذیل علماء جنہوں نے تفسیری احادیث کی ہیں ثقاہت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔

یزید بن ہارون	المتوفی	۱۱۷ھ
شعبہ بن الحجاج	المتوفی	۱۱۸ھ
وکیع بن الجراح	المتوفی	۱۹۷ھ
سفیان عیینہ	المتوفی	۱۹۸ھ
روح بن عبادۃ	المتوفی	۲۰۵ھ
عبدالرزاق بن الہمام	المتوفی	۲۱۱ھ

[1] الاتقان فی علوم القرآن۔ علامہ جلال الدین السیوطی، طبع مصطفیٰ البابی مصر ۱۹۵۱ء جلد ۲ ص ۱۷۸

آدم بن ایاس المتوفی سنہ ۲۲۱ھ

ابوبکر بن ابی شیبہؒ المتوفی سنہ ۲۳۵ھ

اسحاق بن راہویہ المتوفی سنہ ۲۳۸ھ

عبد بن حمید المتوفی سنہ ۲۴۹ھ

بعض علماء نے تفسیری روایات کو علیحدہ کتابی شکل میں جمع کیا۔ امام بقی بن مخلد بھی ان محدثین میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے تفسیر قرآن سے متعلق تمام روایات کو نہایت ثقہ اور قابل اعتماد ذرائع سے نقل کیا ہے۔ امام بقی بن مخلدؒ اس عہد میں گزرے ہیں جس میں تفسیر کے سلسلے میں اسالیب، وجوہ بلاغت اور لغت وغیرہ کی بجائے زیادہ توجہ آیات کے شان نزول، ناسخ منسوخ اور تفسیری روایات کی طرف دی جاتی تھی۔ محدثین اسی طریقہ تفسیر کے حامل تھے۔ بقی بن مخلدؒ کا زمانہ تدوین کا دور تھا۔ جناب بقی بن مخلدؒ نے ایک تفسیر بھی مرتب کی تھی۔ علامہ ابن حزم لکھتے ہیں۔

"امام بقی بن مخلدؒ کی تصنیفات میں قرآن کی تفسیر بھی ہے یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے متعلق میں یقینی طور پر بلا استثناء کہہ سکتا ہوں کہ اسلام میں اس جیسی کوئی تصنیف تالیف نہیں ہوئی۔ محمد بن جریرؒ طبری کی تفسیر اور دیگر تفاسیر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔"[1]

علامہ ابن حزمؒ نے جس جزم و وثوق سے بقی بن مخلد کی تفسیر کو علامہ طبریؒ کی تفسیر پر فوقیت دی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ ابن حزم نے دونوں تفاسیر کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے، نیز ابن حزم کا یہ تبصرہ اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ پانچویں صدی ہجری کے اندلس میں یہ دونوں تفاسیر متداول تھیں۔ علامہ ابن حزمؒ نے اپنی تصانیف میں خاص طور پر اپنی مشہور کتاب "المحلّٰی" میں محمد بن جریر طبریؒ کی اسناد پر احادیث روایت کی ہیں اور استنباط میں ان سے استدلال کیا ہے۔

(باقی)

---

[1] معجم الادباء جلد ۲ ص ۳۶۸

مغربی تہذیب کا بحران

جناب ریاض الحسن نوری صاحب

(دسمبر ۱۹۷۹ء میں شائع شدہ قسط سے آگے)

شراب اور ٹیکس | مغربی دنیا میں ٹیکسوں کی بھرمار ہے مگر حکومتیں عوام کی بھلائی پر بھی خرچ کرتی ہیں، مگر ٹیکس کی زیادہ رقم برائیوں یا اُن کے اثرات پر ہی خرچ ہوتی ہے۔ شراب پر جو رقم فرانس کی حکومت ڈیوٹی کے طور پر وصول کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ رقم عادی شرابیوں (alcoholics) اور ان کے بچوں کی دیکھ بھال پر خرچ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹیکس کی رقوم بیوروکریسی کے ٹھاٹ باٹھ اور اُن کی کرسیاں مضبوط کرتی ہیں۔

بے گناہوں کو زندہ جلانا | قرونِ وسطیٰ کے بعد اور جدید دور کے شروع ہونے سے پہلے یورپ میں لاکھوں عورتوں کو جادوگرنیاں کہہ کر آگ میں زندہ جلایا گیا۔ حتیٰ کہ فرانس کو آزادی دلانے والی ہیروئن جون آف آرک کو بھی جادوگرنی قرار دے کر فرانس کے حکام، ججوں، پادریوں، یونیورسٹیوں کے پروفیسروں، غرض سب نے مل کر زندہ جلا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ عرصہ بعد روم کے پوپ نے اس کو ولی اللہ یعنی سینٹ (saint) کے زمرہ میں شامل کر لیا۔ غرضیکہ یورپ میں عورتوں پر پہلے بھی ظلم ہوتا تھا اور آج بھی ہو رہا ہے۔

بیویاں اور گروپ سیکس | امریکہ وغیرہ میں قرونِ وسطیٰ کے یورپ کی مانند بیویوں کی ادلا بدلی (wife swaping) کا پھر سے رواج ہوتا جا رہا ہے۔ اسے (swinging) بھی کہتے ہیں۔

وہاں کے خاوند اپنی بیویوں کو برابری ومساوات کے نام پر بے وقوف بنا کر اپنی عیاشی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ عورتیں مجبوراً ہی اس کام میں حصہ لیتی ہیں۔ کیونکہ انکار پر اُن کو خاوند سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں مارٹن ہینٹ کی کتاب چھپی ہے جس کا نام sexual Behaviour In The 1970's ہے (یعنی ۱۹۷۰ء کے دہے میں جنسی رویہ) اس سے اور دیگر کتب وتحقیقات بلکہ خود کنزے کی کتب سے بھی ہماری بات واضح ہوجاتی ہے۔ کنزے نے لکھا ہے کہ مرد تمام دنیا کی عورتوں سے تعلقات پیدا کرنے کا خواہش مند رہتا ہے مگر عورت کی فطرت اس کے خلاف ہے۔ مذکورہ بالا کتاب میں مارٹن ہنٹ (morton hunt) نے ایک لیو (LEO) صاحب کا واقعہ بیان کیا ہے۔ انہیں جب گروپ سیکس کا علم ہوا تو وہ ایک ۱۷ سالہ لڑکی کو جسے وہ ڈیٹ کر رہے تھے، اپنے ساتھ "ادل بدل کلب" (swap club) میں لے گئے۔ مرد صاحب تو بہت ہی خوش ہوئے، اُن کے لیے تو گویا عید ہوگئی۔ مگر لڑکی اگرچہ اُن کے ساتھ جاتی رہی مگر ساتھ ساتھ شکایت بھی شروع کر دی کہ تم میرا استحصال کر رہے ہو۔ آخر کار اس ڈر سے کہ کہیں یہ لڑکی اُسے چھوڑ کر نہ چلی جائے اور اُس کا عیش ختم نہ ہو جائے، اس نے اس سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد لڑکی نے سویپ کلب جانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ان میں ناچاقی شروع ہوگئی اور آخر کار ڈیڑھ سال بعد علیحدگی ہوگئی......

لیو صاحب کی بدقسمتی یہ تھی کہ جس لڑکی کو بھی وہ سویپ کلب لے جاتے وہ آخر کار یہی شکایت کرنے لگتی کہ تم میرا استحصال کر رہے ہو۔ لیو کا کہنا ہے کہ یہ اسی کی خصوصیت نہ تھی بلکہ مبادلہ پسند (swinger) جوڑوں کے تعلقات اُس نے خراب ہی پائے۔ لیو نے آخر کار شادی کے خیال کو ترک کر دیا اور ذوّاقی جاری رکھی۔

لیو ہی کہتا ہے کہ ایک شادی شدہ جوڑے نے مجھے گھر پر دعوت دی۔ جب وہ اُن کے گھر پہنچا تو:۔

Husband said very apologetically, don't take this wrong, but would you mind if I go up while you are doing it

میزبان خاوند نے بہت ہی معذرت کے انداز میں کہا کہ تم میری بات کا بُرا نہ ماننا، تم میری بیوی سے شغل کرو۔ اور اُس کے ساتھ ساتھ میں تم کو سدومیت (sadomy) کا تختۂ مشق بناؤں گا۔

اور لیو صاحب کا کمال ہے کہ انہوں نے اس کو بھی قبول کر لیا[1]

ناظرین نے دیکھا کہ یورپین مرد دوسری خواہش پوری کرنے کے لیے اپنی بیوی کی عصمت قیمت میں دیتا ہے۔ پھر وہ اتنا چالاک بھی ہے کہ پستیوں اور ذلتوں کو آزادی اور مساوات کا نام دے کر عورت کو بے وقوف بناتا رہتا ہے۔

چرچ اور عورت مذکورہ بالا طرز عمل سے ہمیں زیادہ حیران اس لیے نہ ہونا چاہیے کہ پال نے جو عیسائیت کا حلیہ بگاڑا تو اس کی بنیاد ہی غلط رکھی۔ برٹرینڈ رسل لکھتا ہے کہ چرچ پال کے اثر کی وجہ سے اب بھی شادی کو اولاد پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں، بلکہ بدکاری کا نعم البدل قرار دیتا ہے[2]۔ حقیقت تو یہ ہے کہ چرچ نے عورت کو اساسی گناہ (orignal sin) کا ذمہ دار ٹھیرایا اور ہمیشہ کے لیے عیسائی دنیا میں اس کو ذلیل اور تمام مصائب کی جڑ قرار دیا ہے۔ مغربی تہذیب اور چرچ نے عورت کو مال مویشی کے درجہ سے بھی کمتر درجہ میں رکھا ہے۔ چرچ نے دولت کمانے کی خاطر نہ صرف قحبہ گری کو جائز قرار دیا بلکہ اس کی کمائی سے گرجا بھی تعمیر کیے۔ خود پادریوں نے قحبہ خانے چلا کر دولت کمائی اور دوسروں کے قحبہ خانوں پر ٹیکس لگایا اور اس طرح ان کی کمائی سے بھی اپنا حصہ بانٹ لیا۔

بنجمن اور ماسٹرز ...... لکھتے ہیں:۔

میونسپلٹیوں اور پوپوں وغیرہ نے رنڈیوں اور قحبہ خانوں پر بھی ٹیکس لگائے اور اس طرح سے کافی آمدنی حاصل کی۔ ایک پوپ کلیمنٹ دوئم نے ان رنڈیوں سے بھی آمدنی حاصل کر لی جو دوسری دنیا میں جا چکی تھیں۔ اس نے ایک قانونِ شرعی ((Bull)) بنایا جس کا مدعا یہ تھا کہ جو عورت کسی بھی وقت پیشہ کرا چکی ہو، مرنے کے بعد اس کی آدھی جائیداد چرچ کو مل جائے گی۔ سپین، پرتگال، جرمنی سوئٹزرلینڈ، فرانس وغیرہم میں قحبہ گری پر ٹیکس لگتا رہا ہے۔ نوٹ کرنے کے قابل یہ بات ہے کہ پانچویں صدی ہجری میں نورمبرگ میں یہ قاعدہ بھی بنا کہ جو رقم رنڈیوں پر خرچ کی جائے وہ ٹیکس سے

(1) FP. 47, 49. Sexual behaviour in the 1970's by M. Hunt

(2) P. 106. Marrige and Morals by Bartrand Russell.

مستثنیٰ قرار دی جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ رنڈیوں سے زیادہ ٹیکس وصول کیا جا سکے۔

اصل بات یہ ہے کہ یورپ کا چرچ عورت کو بنیادی طور پر مجرم اور گناہ کی جڑ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک کائنات کی ہر خرابی کی ذمہ دار عورت ہے۔ رومن کیتھولکوں کو چھوڑیے خود پروٹسٹنٹ مذہب کا بانی مارٹن لوتھر جو نسبتاً زیادہ آزاد خیال سمجھا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے آدم کو تمام جانداروں کا مالک اور حاکم پیدا کیا تھا مگر حوّا نے سب کچھ خراب کر دیا۔[۱]

اس کے برعکس اسلام میں نہ تو عیسائی عقیدے کی مانند اساسی گناہ (orignal sin) کا فلسفہ ہے اور نہ اسلام میں ہر شخص پیدائشی گنہگار ہوتا ہے۔ جہاں تک حضرت آدمؑ کی اوّلین لغزش کا تعلق ہے، قرآن کے نزدیک اس کی ذمہ دار محض حوّا نہ تھیں، بلکہ حضرت آدمؑ اور حوّاؑ دونوں کا اس میں برابر کا حصہ تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ شیطان نے دونوں کو بہکایا۔ فازلهما الشيطن غرض کہ دونوں برابر کے قصور وار تھے۔

میری لینڈ کالج کے بارٹلٹ برلے جیمز Bartlet Burleigh James ph. D قرون وسطیٰ[۲] کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ جرائم اور تشدد کی ملک میں کثرت تھی اور ان پر کوئی روک نہ تھی، نہ صرف یہ کہ قانون کوئی اثر نہ رکھتا تھا بلکہ عوام کے جذبات بھی ایسے نہ تھے کہ حالات بہتر ہو سکیں۔ فضا اس سے مختلف نہ تھی جو کہ آئرلینڈ میں انیسویں صدی کے شروع میں پائی جاتی تھی۔ اس لاقانونیت کا سب سے زیادہ شکار عورتیں تھیں۔ رات کو انہیں زبردستی اغوا کر لیا جاتا اور عصمت دری کے بعد اُن کو زبردستی چرچ لے جایا جاتا۔ جہاں کہ پادری دھمکیوں کی وجہ سے مظلوم عورتوں کی آہ و فریاد کے باوجود اُن کو اغوا کرنے والوں کے ساتھ شادی کے بندھن میں باندھ دیتا تھا۔ وہ عورتیں

---

(1) P. 46 The prostitute in society.
by Harry Benjamin M. D & R.E.L. Masters.

(2) Reader's Digest, June 1979.

(G.L. Simons) لکھتا ہے کہ شروع دور کے عیسائی فادر عورت کو دوزخ کا دروازہ کہتے تھے اور برنارڈشا سینٹ پال کو عورت کا دائمی دشمن کہا کرتا تھا۔ مزید حوالوں کے لیے دیکھیے۔

(A History of Sex) مصنّف (G.L. Simons) صفحات ۸۰، ۱۴۰، ۱۴۸ وغیرہ۔

شادی شدہ ہوتیں تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ ساری کارروائی فریب و ظلم تھی۔ لگان کے جھگڑے آئے دن ہوتے رہتے اور قتل کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ان تمام جرائم میں غریب لوگ ہی حصہ نہ لیتے تھے ...... بلکہ بڑے بڑے اشخاص یا لنوغنڈوں کے ساتھ ان جرائم میں حصہ لیتے تھے[1]

جی۔آر۔ٹیلر (G.R. Taylor) لکھتا ہے کہ اگرچہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں عورتوں کے کچھ حقوق تھے مگر قرونِ وسطیٰ میں شادی شدہ عورت کا قانونی وجود ہی ختم کر دیا گیا ...... سول قانون میں اس کی اجازت تھی کہ خاوند بیوی کو کوڑوں اور لاٹھیوں سے بڑی طرح (violently) مار سکتا تھا۔ خاوند لکڑی کے موٹے ڈنڈے سے مار سکتا تھا مگر لوہے کی سلاخ سے مار کر بے ہوش نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ بیوی کو خاوند کی ملکیت (Property) سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے کسی غیر کی طرف سے اس کی عصمت دری گویا کہ ملکیت کے خلاف جرم تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے ابتدائی دور میں خاوند کا سب سے پہلا کام یہ ہوتا کہ وہ بیوی کے عاشق کے خلاف ہرجانے (damages) کی نالش کرتا۔

جیسا کہ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں خاوند کو اختیار رہتا کہ جب وہ بیوی سے اکتا جاتا تو اس کے گلے میں رسّی ڈال کر بازار لے جاتا اور حقیر سی رقم پر بیچ آتا۔ آج بھی مغرب کے خاوند کے تحت الشعور میں وہی نظریہ کام کر رہا ہے اور وہ بیوی کو محض اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اور اسے اپنی ہوس رانی کی بھینٹ چڑھانے میں اسے آج بھی باک نہیں ہے۔ اصل میں عیسائیت کو خراب کرنے والی چیز رومن تہذیب یا مغربی تہذیب تھی۔ روما کا تو یہ حال تھا کہ بقول بیری بنجمن، ریکارڈ سے

---

(1) P. 191,192. Woman in all ages and in all countries. Women of England by B.B. James Ph. D.

(2) PP. 64,65 Sex in history, by G.R. Taylor.

[3] قدیم یونان میں بھی خاوند کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی بیوی کو جس طرح چاہے حوالے کر دے۔ قدیم روما میں بھی عورت کے کوئی حقوق نہ تھے (ص ۱۴۵، ۱۴۶ سیکس ان ہسٹری مصنفہ (G.L. Simons)

پتہ چلتا ہے کہ چھ سات سال کے بچے بھی جنسی امراض سے مرجایا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ قحبہ خانوں میں دُودھ پیتے بچے بھی داخل کر دیے جاتے تھے۔ جہاں کہ انہیں (felatio) اور اسی قسم کی دوسری حرکات کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ جب روم کے بادشاہ (Domitian) نے دُودھ پیتے بچوں کو قحبہ گری کے لیے استعمال کرنے پر پابندی لگائی تو اس کی بہت تعریف کی گئی[1]۔ روما کی ملکائیں میسالینا (Messalina) اور جولیا وغیرہ مکمل طور پہ پیشہ کرائی تھیں اور روما کے بادشاہ نیرو وغیرہم بھی عمل قوم سدوم میں مبتلا تھے[2]۔ یہ موضوع الگ توجہ چاہتا ہے کہ یورپ کے مقابلے میں اسلام نے عورت کو کیا مقام دیا ہے۔

(باقی)

P. 45. The prostitute in Society. by Harry Benjamin.

(2) P. 42 ibid.

منیر رپورٹ سے منیر رپورٹ تک

جناب نعیم صدیقی صاحب

(۳)

جسٹس منیر صاحب کی کتاب میں جس طرح صفحہ بہ صفحہ ایک ایک فقرے میں [illegible] شگوفے چھوڑے گئے ہیں۔ ان کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوا کہ اگر ہر شگوفے پر بات [illegible] جائے تو ایک تو سلسلہ طویل ہوگا، دوسرے تمام گفتگو "متفرق" طرز کی ہو جائے گی۔ بہتر [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ متفرقات کو چھوڑ کر اہم اصولی بحث کو لیا جائے۔

ہمارے محترم جسٹس منیر نے اسلام کے حق میں جو جو بھی کرم فرماتے ہیں، ان کی اصل بنیاد اس پر ہے کہ وہ اسلام کا غیر سیاسی تصور اختیار کرتے ہیں اور سے سیکولر ریاست کے فریم میں فٹ کر کے دیکھتے ہیں۔ جدید مغربی دورِ تمدن کے تاسیس کرنے والے فلسفیوں اور سیاست کاروں کا یہ کمال ہے کہ ان کے خطوط کے مطابق مسلمانوں پر ظلم و جبر سے جو خالص دنیوی اور لادین حکومتیں مسلط کی گئیں، انہوں نے اپنے نظامِ تعلیم، اپنے معیارِ عزوشرف، اپنے قوانین اور اپنے پروپیگنڈے کے زور سے اسلام کو پوری زندگی کا دین سمجھنے والے مسلمانوں کے ذہن کو جس طرح مسخ کیا، اس کی بہترین معیاری مثالوں میں سے ایک جسٹس منیر ہیں کہ وہ نہ صرف سیکولر تصور کے قائل ہیں بلکہ اس کے پرزور دلائل دیتے ہیں اور علماء کے علاوہ اسلام کے بالمقابل کھڑے ہو کر اپنا دعویٰ دھڑلے سے پیش کرتے ہیں۔ یہ ان چند خاصانِ مغربیت میں سے ہیں جو اسلام کو مغربی طرزِ فکر کے سانچے میں ڈھال کر اس کی من مانی شکل بناتے ہیں، مگر یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ اسلام کے معیار پر دوسروں کے مسلط کردہ

افکار کو پرکھیں۔

اصل قضیہ یہ ہے کہ سرے سے وہ نظریہ مذہب (THEORY OF RELIGION) کو نہیں جانتے کہ آخر مذہب کس کی طرف سے ہے، کیوں ہے، وہ کن وجوہ سے قابلِ اعتماد ہے اور انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اس کے برسرِ عمل ہونے سے کیا کیا مفید اور اعلیٰ نتائج انسانیت کو ملتے ہیں۔

مذہب سے پہلے نظریۂ مذہب کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اگر ایک صحیح نظریۂ مذہب ہاتھ آجائے تو پھر دنیا بھر کے مروج مذاہب کو بآسانی اس پر جانچا جا سکتا ہے۔

ہمارا نظریۂ مذہب (یا اگر نظریہ کا لفظ باعثِ الجھن ہو تو ہماری حکمتِ مذہب) یہ ہے کہ:

۱۔ یہ کائنات ایک خدا کی تخلیق کردہ ہے اور اس میں جتنی بھی مخلوق پائی جاتی ہے وہ سب کی سب اسی کے اقتدار اور قانون کی پابند ہے، اور اسی وجہ سے اس میں انتہائی کڑا نظم ہے، جس میں بڑے سے بڑے اجرام اور ننھے سے ننھے ذرّے سبھی جکڑے ہوئے ہیں، اور اسی لیے کائنات تخریب کے بجائے تعمیر و ارتقاء کی طرف بڑھ رہی ہے۔

پس انسان بھی خدا کی مخلوق ہے اور اس کے لیے بھی جس طرح جسم اور نفسیات کے قوانین ہیں، اسی طرح انسانی زندگی کے لیے ایمانی، اخلاقی اور معاشرتی و تمدنی قوانین بھی خدا کی طرف سے مقرر ہیں۔ ان مقرر شدہ قوانین کی پابندی میں نظم اور ارتقاء ممکن ہے، ورنہ فساد اور تصادم اور تباہی کا خطرہ ہے۔

۲۔ جس پوری کائنات کا مسلک خدا کی اطاعت (اسلام) ہو اس کی بے شمار مخلوق اور موجودات کے درمیان اگر ایک مخلوق زندگی کے کسی حصے میں اطاعت و اسلام کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرلے تو اسے کائنات میں ایک انمل بے جوڑ پوزیشن حاصل ہوگی۔

۳۔ انسانی زندگی میں سیکولرسٹوں کے تصورِ مذہب کے مطابق اگر ذاتی اور نجی اور گھریلو معاملات میں خدا کی طرف سے مذہبی رہنمائی کی ضرورت ہے تو پھر ان کے مقابلے میں بڑے بڑے سیاسی و معاشی اور بین الاقوامی معاملات میں یہ ضرورت کیوں نہیں ہے۔ اگر ان دائروں میں عقل اپنا راستہ آپ تلاش کرنے پر قادر ہے تو وہ ذاتی اور نجی اور گھریلو زندگی میں کیوں نہیں؟

۴ - زندگی کے کسی ایک چھوٹے سے دائرے کے لیے خدا کو ماننا اور اس کے مذہب کو قبول کرنا، اور دوسرے بڑے بڑے دائروں میں خدا کی خدائی کو چھوڑ کر اپنی خدائی جما لینا اور اس کے مذہب سے بے نیاز ہو کر اپنا مذہب خود گھڑنا یہ تو شرک کی بدترین صورت ہے۔

اگر کوئی خدا نہیں ہے تو پوری زندگی کو آزاد ہونا چاہیے، اور خدا ہے تو اس کی خدائی کا سکہ زندگی کی سلطنت کے کسی ایک صوبے یا ضلعے میں کیوں چل کر رہ جائے، وہی ایک سکہ ساری زندگی میں چلنا چاہیے۔

۵ - ہماری حکمتِ مذہب یہ ہے کہ خدا کی مرضیات اور اس کے قوانین کو اس کے مقرر کردہ رسول پہنچانے آتے ہیں، جو خدائی تعلیم کے تسلسل اور اس کے معیار اور اس کے انداز نیز اپنے غیر معمولی کردار اور شروع سے آخر تک اپنے بےلوث رویے بلکہ اپنی دی ہوئی قربانیوں کی روشنی میں پہچانے جاتے ہیں۔

خدا کے یہ رسول خدا کے مقرر کردہ نمائندے ہوتے ہیں اور جہاں یہ خدا کی کتاب ہدایت و حکمت (مع قانون) لاتے ہیں، وہاں یہ اس پر ذاتی طور پر بھی عمل کر کے، اس کے تقاضوں کے مطابق ایک معاشرہ تیار کر کے اور ایک ریاست کی تشکیل کر کے دکھا دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی تعلیم اور اس کا قانون انسان سے کیسی انفرادی، کیسی سوشل، اور کیسی سیاسی و ریاستی زندگی چاہتا ہے۔

کسی کا یہ منصب نہیں کہ وہ خدا کے رسولوں کی پیش کردہ ہدایت، حکمت، قانون اور نمونہ کار کے ٹکڑے کر کے یہ کہے کہ اس میں فلاں فلاں ٹکڑے تو مجھے قبول ہیں، فلاں قبول نہیں۔ دوسری چیزیں میں کسی اور مذہب سے، کسی اور گروہ فلاسفہ سے، کسی اور تحریک سے قبول کر لوں گا۔

بس یہ ہے بنیادی بات! جو ذہن اس میخ کو اپنے اندر گاڑ لے، پھر نہ وہ مسلمان کی تعریف جان سکتا ہے نہ کافر کے معنی اس کی سمجھ میں آسکتے ہیں، نہ وہ اسلامی ریاست کا تصور اخذ کر سکتا ہے، اور نہ یہ راز اس پر کھل سکتا ہے کہ اسلامی ریاست کا نظریاتی ریاست ہونا چہ معنی دارد؟

ہمارا نظریہ مذہب یہ ہے کہ ایک خدا ہے، اس کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے تمام انسان برابر کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان سب کو ایک ہونا چاہیے۔ اور ان انسانوں کو خدا کا مقرر کردہ ایک ہی نظام اختیار کرنا چاہیے۔ قرآن کی واضح تعلیمات وحدتِ الٰہ، وحدتِ آدم اور وحدتِ دین

کے تین نکات دینی ہے جس سے تو جبار کا بنیادی تصور قائم ہوتا ہے۔

ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جسٹس منیر کا بنیادی تصورِ مذہب کیا ہے؟

سیکولر تصورِ مذہب اور اسلامی تصورِ مذہب کے فرق کی وجہ سے دونوں طرف ریاست کے تصورات الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

مغرب کو جیسا ثابت ہے سابقہ پڑا جس کے پاس نہ تو تاریخی شہادتوں کی بنیاد پر ثابت شدہ خدا کی کتاب غیر محرف حالت میں موجود تھی، نہ وہ پورا ضابطۂ حیات اس سے اخذ کر سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے تھیوکریسی اور پاپائیت کا راستہ اختیار کیا اور خدا کے قانون کے خلا کو پادریوں کے طبقے نے اوّل روز سے بھرتے رہنے کی کوشش کی۔ اس طرح خدا کے مذہب کے تصور سے جزو کے ساتھ پادریوں کا گھڑا ہوا بہت بڑا حصہ مذہب بھی اختیار کر لیا گیا۔ ایسے مذہب کے تحت جب تھیوکریسی قائم ہوئی تو وہ وبال بن گئی اور اس کے خلاف (اسلامی اثرات کے تحت) ریفارمیشن کی تحریک اٹھی جس نے بعد از خرابیٔ بسیار کلیسا اور ریاست کو الگ کر دیا۔ یوں وہ نیا سیکولر تصورِ ریاست بنا اور اسی طرح غلط ہو کر رہ گیا جس طرح اس سے پہلے تھیوکریسی غلط تھی۔

یہاں پہنچنے کے بعد اسلامی ریاست کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا ہے؟

سب سے پہلے تو میں منیر صاحب کو ایک جگہ سے نکالنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ نظریاتی (اسلامی) ریاست کے تصور پر آ پڑتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ پہلی بار یہ اصطلاح انہوں نے قادیانی تحقیقاتی عدالت میں سنی تھی، یا پھر محمد ایوب کی کابینہ میں۔

میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جہاں تک اس اصطلاح کا تعلق ہے، تحریک اسلامی کی بالکل ابتداء (۱۹۴۱ء) سے ہر شخص دین کے وسیع تصور میں ریاست کو مضمر سمجھتا رہا ہے اور بارہا تقریروں اور لٹریچر میں نظریاتی یا اعتقادی ریاست کا حوالہ آیا ہے۔ یہاں میرے سامنے ایک مقام ہے جہاں ـــــ غیر مسلموں کے حقوق نامی پمفلٹ کی ابتداء ہی میں یہ جملہ درج ہے کہ "اسلام کی حکومت دراصل ایک اصولی (IDEOLOGICAL) حکومت ہے۔" یہ مضمون ماہنامہ ترجمان القرآن بابت اگست ۱۹۴۸ء میں چھپا ہے[1]۔

---

[1] ملاحظہ ہو، اسلامی ریاست از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور، ص ۵۷۵

ایک اور ضروری حوالہ:

"..... ہم دیکھتے ہیں کہ وہ (قرآن) لفظِ دین کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے اور اس سے مراد ایک ایسا نظامِ زندگی لیتا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کرے، اس کے حدود و ضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے، اس کی فرمانبرداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے مفہوم پر حاوی ہو، موجودہ زمانہ کا لفظ "اسٹیٹ" کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے۔ لیکن ابھی اس کو دین کے پورے معنوی حدود پر حاوی ہونے کے لیے مزید وسعت درکار ہے"[1]

پھر سورۂ مومن کی آیت ۲ پر کلام کرتے ہوئے مولینا فرماتے ہیں:۔

"قرآن میں قصۂ فرعون و موسیٰؑ کی جتنی تفصیلات آتی ہیں ان کو نظر میں رکھنے کے بعد اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہاں دین مجرد "مذہب" کے معنوں میں نہیں آیا ہے، بلکہ ریاست اور نظامِ تمدن کے معنی میں آیا ہے۔ فرعون کا کہنا یہ تھا کہ اگر موسیٰؑ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو اسٹیٹ بدل جائے گا"[2]

مولانا نے مغربی تھیوکریسی اور ریاست اور کلیسا کی تفریق اور سیکولرازم پر بحثیں کی ہیں تاکہ وہاں کے نظریۂ ریاست کا پس منظر واضح ہو جائے۔ لیکن علامہ اقبال مرحوم نے بھی اس موضوع پر کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو والی خط و کتابت میں انہوں نے ان مباحث کو جس خوبی اور صراحت سے لیا ہے وہ اس وقت کے ہم جیسے نوجوانوں کے دل و دماغ کو تہ و بالا کر دینے والے تھے۔ فلسفۂ مغرب کی تمام مرعوبیتیں اس شخص کے خیالات سامنے آنے پر ہوا ہو گئیں، اور بہ حیثیت مسلمان اپنے اوپر نوجوان طبقوں کا اعتماد پہلی بار بحال ہونے لگا۔ علامہ اقبال نے اپنی تحریروں میں تجزیہ کر کے

---

[1] ملاحظہ ہو قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ از مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی مخفور ص ۹۲/۹۳

[2] ایضاً ص ۹۲

بتایا کہ اسلام مغربی اداروں سے ہٹ کر ایک جداگانہ قسم کی ہیئت اجتماعیہ یا ہیئتِ سیاسیہ ہے۔ وہ مسلمانوں کی ہیئت سیاسیہ سے مذہب کو کاٹ کر الگ نہیں لے جاتے جو ایک جان کی طرح اس کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر میں لکھتے ہیں:۔

"ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی، اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے ..... اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت (یا ہیئت اجتماعیہ۔ ف۔ ح) کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے۔"[1]

مزید توضیح ملاحظہ ہو:۔

"کسی فرانسیسی کے مذہب پر نکتہ چینی کیجیے وہ بہت ہی کم متاثر ہوگا، اس لیے کہ آپ کی نکتہ چینی نے اس اصول کو مس نہیں کیا، جو اس کی قومیت کی روح رواں ہے۔ لیکن ذرا اس کے تمدن، اس کے ملک یا پولٹیکل سرگرمی کے کسی شعبے کے متعلق اس کی قوم کے مجموعی طرزِ عمل یا شعار پر تو خردہ گیری کر کے دیکھیے، پھر اس کی جبلی عصبیت کا شعلہ نہ بھڑک اٹھے تو ہم جانیں۔ بات یہ ہے کہ فرانسیسی کی قومیت کا اظہار اس کے معتقدات مذہبی پر نہیں بلکہ جغرافیائی حدود یعنی ملک پر ہے۔

ہماری حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت ایک شے معہود فی الذہن ہے، موجود فی الخارج نہیں۔ بلحاظ ایک قوم ہونے کے ہم جس مرکز پر آ کر جمع ہو سکتے ہیں۔ وہ مظاہر آفرینش کے متعلق ایک خاص قسم کا اشتراکی سمجھوتہ ہے جو ہم نے آپس میں کر رکھا ہے۔

پس اگر کسی کا ہمارے مذہب کو برا کہنا، ہماری آتش عصبیت کو برافروختہ کرتا ہے۔ میری دانست میں یہ برافروختگی اس فرانسیسی کے غصہ سے کچھ کم واجبی نہیں جو

---

[1] مقالاتِ اقبال ۔ از محمد رفیق افضل ۔ ص ۱۲۰

اپنے وطن کی برائیاں سن کر بھڑک اٹھتا ہے[1]۔

پھر وہ کہتے ہیں:-

"مذہبی خیال ...... اسلامی جماعت کی ہیئت ترکیبی کا مدار علیہ ہے[2]۔"

چند الفاظ اور ......

"مذہب کو فلسفۂ نظری بنانے کے لیے کوشش کرنا میری رائے میں بے سود محض ہے ...... بلکہ اس کی اصلی غایت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لیے ایک مربوط اور متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے۔ مذہب سیرت انسانی کا ایک نیا اسلوب یا نمونہ پیدا کر کے ...... ایک نئی دنیا کو نیست سے ہست کرتا ہے[3]۔"

اور آخر میں کیا خوب کہا:-

"اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں[4]۔"

اصل بنیادی بات تو سمجھنے کی یہی ہے کہ اسلام بہ طور کلمہ جامعہ، اسلام بہ طور نقیب دعوت، اسلام بہ طور ہیئت اجتماعیہ، اسلام بہ طور سیاسی اسٹیٹ، اسلام بہ طور تحریک انقلاب اور تحریک جہاد ہم پر واضح ہو جائے۔ پھر مسلمان کی تعریف بھی مشکل نہیں، پھر اسے چلانے والوں کے اوصاف بھی متعین ہو سکتے ہیں، پھر اس کا معاملہ مرتدین سے بھی سمجھ میں آسکتا ہے، اور اسی طرح تمام دوسرے متعلقہ سوالات واضح ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہر بات کے معانی اور سندات سیکولرازم کی ڈکشنری میں تلاش نہ کی جائیں۔

دور کیوں جائیے سیکولرازم جس نے پہلے مذہب کو نظامِ زندگی سے الگ کر کے رکھا،

---

[1] ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر - از علامہ اقبال - بہ حوالہ گفتار اقبال ص ۱۲۲

[2] ایضاً ص ۱۲۳

[3] ایضاً ص ۱۲۴

[4] ایضاً ص ۱۲۴

پھر آہستہ آہستہ اُسے دبانا اور کچلنا شروع کیا۔ اور اُس کے ساتھ اخلاقی اقدار و روایات بھی درہم برہم ہونے لگیں، آج اسی کی بنائی ہوئی دنیا کو دیکھ لیجیے کہ اُس نے مجموعی طور پر انسانوں کو کیا دیا ہے۔ کشمکش، ٹکراؤ، تشدّد، جارحیت، خون خرابہ، لوٹ مار، دولت پرستی، کمزوروں سے استحصال عیاشی و فحاشی، کاروباریت، مشینیت، حیوانیت اور بے اطمینانی اور بے مقصدی!

تو اب آپ اس انسانیت سوز عفریت کو دودھ پلانا چاہتے ہیں۔

تحریکِ ریاستِ اسلامی بہر حال ہم لوگ جنہوں نے جوانی میں اقبال کی فکر سے پرورش پائی۔ اور جنہیں مولانا مودودی سے اسلام کا تحریکی شعور ملا۔ ہمارا حال تو یہ تھا کہ ہم ۱۹۴۰ء سے ہی اپنے دوستوں سے کہتے پھرتے تھے کہ اُٹھو اور اسلامی ریاست اور اسلامی تہذیب کا احیاء کریں۔ ہمارے ہاں نظریاتی ریاست (IDIOLOGICAL STATE) کے دن رات چرچے رہتے تھے۔ آپ ذرا کلمہ طیبہ کے مفہوم کے خزانے کھول کر دیکھیے۔ ایک شخص دنیا کے کسی گوشے میں بیٹھا ہوا کہتا ہے کہ میں ایک خدا کے سوا کسی کے اقتدار، کسی کی قانون سازی کو جائز نہیں مانتا، کسی کی تقسیم حلال و حرام اور کسی کی مقررہ حدود کو میں قبول نہیں کرتا۔ میں محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے علاوہ کسی کو اپنا قائد حیات نہیں مانتا۔ اور اسلام کے سوا کوئی ہیئت اجتماعیہ مجھے قبول نہیں، کوئی دوسرا سیاسی و معاشی نظام مجھے گوارا نہیں ہے، کوئی اور تہذیب میرے ایمان کی کسوٹی پر درست نہیں بیٹھتی ـــ تو ایسے شخص کو کیا حیثیت دی جائے گی۔

میں کہتا ہوں جسٹس منیر صاحب! یہ شخص اپنی ذات میں بالقوۃ اسلامی ریاست ہے اور اسے وجود میں لانے کے لیے اسلام کی اصلاحی تحریک کا علمبردار ہے۔

یہاں ہم دس بارہ سال تک تحریر و تقریر میں اسلامی اسٹیٹ اور اسلامی انقلاب کی باتیں کرتے رہے ـــ ہمیں چھوڑیے، کم سے کم اقبال اور مودودی نے تو حکیمانہ اور مفکرانہ سطح پر اس بحث کو اُٹھایا تھا۔ آپ کو واقف ہونا چاہیے تھا۔

مگر ایک جج جس نے مسلمانوں کا پرسنل لا پڑھ لیا ہو اور جس کے ذہن میں یہی تصور راسخ ہو کر خدا کے انبیاء نے مل جل کر اس دنیا کو ایسے لوگ فراہم کیے تھے جو دنیا کی ریاستوں میں بس ذمّی یا

اقلیتیں بن کر اپنے لیے پرسنل لا کے مطالبے کرتے رہیں، اُسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اپنی عدالت کی باہر کی چیزوں کو جاننے کی کوشش کرتا۔

کوئی مسلمان جہاں جہاں بھی پورے شعور اسلام کے ساتھ موجود ہے، اس کی زندگی اپنی جگہ ایک محدود سی اسلامی ریاست ہے۔ وہ آگے بڑھنے کے لیے ایک جماعت کا ضرورت مند ہے، پھر اور آگے بڑھنے کے لیے اُسے ایک وطن کی بھی ضرورت ہوگی۔ جہاں وہ اور اُس کی جماعت کلمہ طیبہ کی انقلابی تعلیم کو روبعمل لا سکے۔ اور جب تک ایسا نہیں ہو جاتا، ہر مسلم اپنے ماحول میں مضطرب رہے گا۔ ماحول اُس کی ذہنی اور جسمانی اور تہذیبی زندگی کو دباؤ سے مسخ کرے گا۔ وہ ماحول کے خلاف حتی الامکان تک مزاحمانہ سرگرمیاں جاری رکھے گا۔ حل یہی ہے کہ یا تو وہ اپنے ماحول کو بدلنے پر قادر ہو جائے۔ یا عالمی پیمانے پر کسی بھی بڑی تحریک اسلامی کے جہاد میں شامل ہو جائے۔

آج کے اس مبحث کو لکھتے ہوئے میں نے منیر صاحب کی کتاب کی بہت سی جزوی باتیں الگ چھوڑ دی ہیں۔ اور شاید آگے بھی ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اُن کے ہاں متفرق باتیں اتنی ہیں کہ اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اُن کی طرح کی فرصت اور معاشی اطمینان چاہیے۔

بیعت عقبہ میں جو لوگ حضورؐ سے بیعت باندھتے ہوئے اس کا اقرار کر رہے ہیں کہ ہم اپنی جانوں کی ہلاکت اور اموال کی تباہی کے خطروں کے باوجود آپ کا ساتھ دیں گے۔ وہ جانتے تھے کہ معاملہ صوفیانہ یا فلسفیانہ مذہب یا دھرم کا نہیں ہے، یہ تو ایک تحریک جہاد ہے جس میں ہم شریک ہو رہے ہیں۔ اور مکہ میں مظالم بھگتنے والے نو مسلموں میں سے کون نہیں جانتا تھا کہ یہ ایک انقلابی حرکت کا آغاز ہے جو سارا نقشہ پلٹ دے گی۔

رسائل و مسائل

مدیر "بینات" کی بہتان تراشی

ملک غلام علی صاحب

سوال:۔ ماہنامہ "بیّنات" علامہ بنوری ٹاؤن کے مدیر آج کل مولانا محمد یوسف ہیں۔ ان کے قلم سے "بینات" کا ایک خاص شمارہ رجب شعبان ۱۳۹۹ھ میں چھپا تھا جسے اب دوبارہ کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے

۔ اس کے صفحہ نمبر ۱۲۸ پر مولانا مودودیؒ پر تنقید کا آغاز یوں کیا ہے:

"وہ جب تہذیب جدید اور الحاد و زندقہ کے خلاف قلم اٹھاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا شیخ الحدیث گفتگو کر رہا ہے اور جب وہ اہلِ حق کے خلاف خامہ فرسائی کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے مسٹر پرویز یا غلام احمد قادیانی کا قلم چھین لیا ہے،

مولانا مودودی کا قلم حریم نبوت پہنچ کر بھی ادب ناآشنا رہتا ہے اور وہ بڑی بے تکلفی سے فرماتے ہیں:

"موسیٰ علیہ السلام کی مثال اس جلد باز فاتح کی سی ہے جو اپنے اقتدار کا استحکام کیے بغیر مارچ کرتا ہوا چلا جائے اور پیچھے جنگل کی آگ کی طرح مفتوحہ علاقہ میں بغاوت پھیل جائے۔"

(رسالہ ترجمان القرآن جلد ۲۹، عدد ۴، ۵)

یہ منسوب کردہ عبارت چونکہ کسی کتاب کی بجائے ترجمان کے ایک پرانے رسالے سے نقل کی گئی ہے اس لیے یہ تحقیق کرنا دشوار ہے کہ اسے صحیح طور پر نقل کیا گیا ہے یا نہیں۔ اگر

یہ رسالہ آپ کے پاس ہو تو آپ سے دیکھ کر حقیقت واضح کریں اور ضروری تشریح ترجمان ہی میں کر دیں تاکہ سب کے لیے باعث اطمینان ہو اور مولانا مرحوم اور تحریک اسلامی کے خلاف سوئے ظن کا جس حد تک ممکن ہو، ازالہ و سدباب ہو۔

جواب:۔ مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب نے ترجمان القرآن جلد ۱۲ عدد ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء شوال ۱۳۶۵ھ کی عبارت کا جو ٹکڑا مولانا مودودی کی جانب منسوب کر کے اور عدل و انصاف اور دیانت و متانت کا دامن چھوڑ کر اس پر حاشیہ آرائی کی ہے، یہ عبارت مولانا مرحوم کی نہیں ہے، بلکہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے تحریر کردہ اشارات کا ایک حصہ ہے، پھر اس اقتباس کو نقل کرتے وقت بھی خیانت اور قطع و برید سے کام لیا گیا ہے۔ مولانا اصلاحی کی عبارت درج ذیل ہے۔

"ایک داعی کا جس طرح یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے احکام و قوانین سے آگاہ کرے، اسی طرح اس کا یہ بھی فرض ہے کہ پورے اہتمام کے ساتھ لوگوں کی تربیت بھی کرے تاکہ اس کی تعلیم لوگوں کے فکر و عمل کے اندر اس طرح راسخ ہو جائے کہ سخت سے سخت آزمائش میں بھی ان پر اس کی گرفت قائم رہ سکے۔ جو داعی صرف تعلیم کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور اس چیز کا شوق اس پر اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ تربیت کے لیے جو صبر و انتظار مطلوب ہے اس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس کی مثال اس جلد باز فاتح کی ہے جو اپنے اقتدار کے استحکام کی فکر کیے بغیر مارچ کرتا ہوا بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس طرح کی جلد بازی کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ایک طرف وہ فتح کرتا ہوا آگے بڑھے گا، دوسری طرف اس کے مفتوحہ علاقہ میں جنگل کی آگ کی طرح بغاوت پھیلے گی۔"

ہر منصف مزاج جب مولانا اصلاحی کی عبارت اور مولانا لدھیانوی کا منقولہ حوالہ کھلے دل اور کھلی آنکھ سے پڑھے گا، دونوں میں نہایت واضح اور بیّن تفاوت محسوس کرے گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی تدلیس و تحریف کیوں کر، کیسے رونما ہوئی؟ یہ معاملہ دو حالتوں سے خالی بہر حال نہیں ہو سکتا۔ یا تو مولانا لدھیانوی کے سامنے اصل ترجمان القرآن کا شمارہ موجود تھا اور آپ نے عمداً، دیدہ و دانستہ مولانا اصلاحی کی عبارت کو مولانا مودودیؒ کے سر چپک دیا اور لگے ہاتھوں عبارت میں بھی حسب منشا کتر بیونت کا عمل فرما دیا۔ کیونکہ صراط مستقیم پر لوگوں کو گامزن کرنے کے لیے انہیں "مودودی" سے

تنفر و تنوحش کرنا بہر صورت ناگزیر ہے۔ دوسری صورت اور امکان یہ بھی ہے کہ مولانا محمد یوسف صاحب کے سامنے ترجمان القرآن نہیں تھا اور کسی دوسرے معاند مکابر نے مولانا اصلاحی کی عبارت کو مسخ کرکے اور اسے مولانا مودودی کی تحریر بنا کر پیش کر دیا تھا۔ جسے مولانا لدھیانوی نے جوں کا توں بلا تامل "بینات" میں دے دیا۔ اور اب تک برابر کتابی ایڈیشنوں میں دئے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن اس دوسری صورت میں بھی امانت و دیانت کا ادنیٰ تقاضا یہ تھا کہ اصل ترجمان پڑھنے کی زحمت گوارا کی جاتی۔ ترجمان کی پرانی فائلیں نایاب نہیں ہیں، بہت سے قارئین کے پاس دستیاب ہیں۔ ترجمان القرآن کے دفتر کو خط لکھ کر حقیقت حال بآسانی معلوم کی جا سکتی تھی۔ لیکن اس تکلیف کے بغیر محض کسی غیر ذمہ دار ناقل کی روایت کو آگے نقل کر دینا اور ملک کے داخل و خارج میں ہزاروں ناظرین کو یہ باور کرا دینا کہ مولانا لدھیانوی نے یہ عبارت بلا کم و کاست اور براہ راست ترجمان سے نقل کی ہے اور یہ مولانا مودودیؒ کے قلم سے نکلی ہے، کیا یہی وہ معیار ہے جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ "اختلافات کو اس معیار پر جانچا گیا ہے اور منصف شخص کے لیے حق کی تلاش میں کوئی دقت نہیں رہ جاتی"۔ کیا دروغ برگردنِ راوی کہہ کر ایسی تلبیس و تدلیس آپ کے لیے جائز ہو جائے گی۔ حالانکہ آپ خود اس دروغ کے راوی بن رہے ہیں اور آپ کے اور ترجمان کے مابین کوئی دوسرا راوی ہے تو آپ اسے حذف کر رہے ہیں۔ کیا یہ فرمانِ نبویؐ آپ کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا کہ كفى بالمرء كذبا أن يحدث بكل ما سمع؟

پھر معاملہ خواہ مولانا مودودیؒ، مولانا اصلاحی یا شخصِ دیگر کی تحریر کا ہو، اصل چیز جو قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ صاحبِ تحریر نے اپنی زندگی میں کچھ اور بھی لکھا ہے یا اس کا قلمی سرمایہ بس ان دو چار فقروں پر مشتمل و منحصر ہے جنھیں بنیاد بنا کر اس کے برسرِ حق یا برسرِ باطل ہونے، اس کے ہدایت یافتہ ہونے یا مبتلائے ضلالت ہونے کا فتویٰ رسید کیا جا رہا ہے؟ بالخصوص موضوعِ زیرِ بحث پر اگر لکھنے والے نے دوسرے مواقع پر اظہارِ خیال کیا ہو اور وہ بھی تحریری شکل میں موجود ہو، تو اس سے آنکھیں بند کر لینا پرلے درجے کی ناانصافی اور تعدی ہے جس کا آج کل مسلمانوں کا ہر دینی و مذہبی گروہ ارتکاب کر رہا ہے اور فریقِ ثانی کے ساتھ وہی ظلم و زیادتی روا رکھ رہا ہے جس کے شکار ہونے کا رونا وہ خود رو رہا ہے۔ مولانا محمد یوسف صاحب کے اکابر دیوبند کے تحریری ٹکڑوں پر کیا تکفیر و تفسیق

کا حکم نہیں لگایا گیا؟ ایک مرتبہ تو مفتی دیوبند نے یہ کارنامہ انجام دیا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی مشہور تصنیف "تصفیۃ العقائد" کی ایک عبارت پر فتوئے کفر جڑ دیا۔ بعد میں جب یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ تحریر تو حضرت نانوتوی کی ہے تو مفتی صاحب کی حالت قابل دید اور قابل رحم تھی۔

مدیر بینات اور قارئین بینات نے اگر اپنی آنکھوں پر پٹی نہیں باندھ لی اور دل کے دروازوں پر تالے نہیں ڈال دیے تو میں اُن سے درخواست کروں گا کہ وہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی تفاسیر اور دوسری تحریریں تعصب و تحزب سے مادرا ہو کر پڑھیں اور پھر خدا اور محاسبۂ آخرت سے ڈرتے ہوئے خدارا دوبارہ فیصلہ کریں کہ یہ تحریریں اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیائے کرام کی ذواتِ عالیہ پر ایمان اور ان کا احترام و اکرام سکھاتی ہیں یا صراطِ مستقیم سے ہٹاتی اور دُور بھگاتی ہیں؟ جہاں تک مولانا اصلاحی کی تحریر مذکور کا تعلق ہے، یہ ایک طویل سلسلۂ اشارات کا جزو ہے۔ جن کے لیے ترجمان کے قدیم شمارے تلاش کرنے کی حاجت نہیں۔ یہ پورے مباحث کتابی شکل میں "دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار" کے زیرِ عنوان چھپ چکے ہیں۔ اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی قائم کردہ مرکزی انجمن خدام القرآن سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ مولانا اصلاحی صاحب کی جس محرف عبارت کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے، اس میں بیان کردہ مضمون کو مولانا اصلاحی اپنی تفسیر تدبر القرآن میں مختلف مقامات پر نئے پیرائے یا انداز میں بار بار واضح کر چکے ہیں مثلاً سورۂ طٰہٰ (آیت ۸۴) کی تفسیر (تدبر القرآن جلد چہارم ص ۲۱۲) پر فرماتے ہیں:

"یہ بات ہم جگہ جگہ ظاہر کر چکے ہیں کہ حضرات انبیائے کرام سے اگر کوئی لغزش صادر ہوتی ہے تو وہ اتباعِ ہویٰ کی نوعیت کی نہیں ہوتی۔ بلکہ کبھی کبھی وہ حق اور خدا کی رضا طلبی کی راہ میں حدِ مطلوب سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز فی نفسہٖ کوئی بُرائی نہیں ہے لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام چونکہ میزانِ حق ہوتے ہیں اور ان کا ہر قول و فعل دوسروں کے لیے نمونہ ہوتا ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اُن کی اس طرح کی باتوں پر بھی گرفت فرماتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی اس عجلت پر بھی گرفت ہوئی۔"

مدیر بینات نے جو ٹکڑے مولانا اصلاحی یا مولانا مودودی کی تفسیر سے کاٹ کر دیے ہیں۔ ان میں انبیائے کرام

کی جن بعض زلات کا ذکر ہے اُن کی حقیقت و ماہیت وہی ہے جو مولانا اصلاحی کے الفاظ میں اُوپر بیان کر دی گئی ہے۔ جو شخص بھی ان مقامات پر آیات کی تشریح کرے گا، بہر حال وحی کی زبان میں کلام نہیں کرے گا، نہ قرآن و حدیث کے الفاظ دہرائے گا۔ کوئی متقی و متدین مسلمان بارگاہ الٰہی یا بارگاہِ نبوی میں گستاخی و بے ادبی کی جرأت بلکہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اور کرے تو اس کا ایمان سلامت نہیں رہ سکتا۔ اس لیے جو حضرات اپنے لیل و نہار دین ہی کی خدمت میں بسر کرتے ہیں، انہیں دوسرے خادمانِ دین کے بارے میں لب کشائی اور خامہ فرسائی کرتے ہوئے اتنی بدگمانی سے تو کام نہیں لینا چاہیے کہ انہیں اپنے اور اپنے مخصوص گروہ کے ماسوا ہر شخص غلام احمد پرویز اور غلام احمد قادیانی نظر آنے لگے۔

حرفِ آخر کے طور پر میں مولانا لدھیانوی کی خدمت میں گذارش کروں گا کہ اسلامی مملکت اور سرزمین پاکستان میں ایسے افراد بھی دندناتے پھر رہے ہیں جو علانیہ یہ کہتے اور لکھتے ہیں کہ "خدا مجرم ہے"، "تمہارے فرشتوں کی ایسی کی تیسی، تم اور تمہارے فرشتے سب فراڈ ہیں"۔ "اس خدا پر ہم قدرت حاصل کر لیں گے"، "خدا انسان کے خلاف کفر بکتا ہے" (معاذ اللہ)، "آدمی کو آدمی سے لڑانے والا خدا"، "خدا کو انصاف کی عدالت میں پیش کرو۔ میں اُسے مجرم قرار دیتا ہوں"۔ ایسی کفریات و ہفوات اسی شہر سے چھپ کر شائع ہوتی ہے جہاں سے "بینات" نکلتا ہے۔ لیکن اہل دین کی باہمی خانہ جنگی نے ان اعدائے دین اور ننگِ انسانیت شیطانوں کی راہ کشادہ کر رکھی ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

(بقیہ اشارات)

براہ کرم اپنا پورا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانے کی کوشش کیجیے۔

رفیقِ عزیز! کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے اندر کچھ ہم سفروں کے لیے کینہ و کد کا مخفی اڈا ہو۔ اور انہیں سامنے رکھ کر ایسے موضوعات ڈھونڈو، ایسی بحثیں چھیڑو اور ایسے مصرعے اٹھاؤ، جن کی زد اُن پر پڑ سکتی ہو؟

کہیں تمہارے اندر کچھ افراد کے لیے انتقامی رجحانات کی لہریں تو نہیں اٹھتیں کہ جن کے تھپیڑے اُن افراد ہی کو نہ لگتے ہوں بلکہ سا منہ ساہنوز دین کی دعوتی سرگرمیوں کو بھی تلپٹ کر دینے والے ہوں۔

کہیں تمہارے اندر ایسی کدورتیں اور بیزاریاں تو موجود نہیں ہیں جن کی وجہ سے جو کچھ کام ہو رہا ہو، اُسے بھی نقصان پہنچتا ہو۔ اور ایک چھپی ہوئی بیماری دل کی چھوت آہستہ آہستہ دوسروں کو بھی لگتی رہتی ہو۔

کدورتوں اور بیزاریوں کا حساب ایسے دوستوں کی فہرست مرتب کر کے لگایا جا سکتا ہے جن کے قریب جانے اور ربط و ضبط رکھنے اور جن کے لیے کلمۂ خیر کہنے سے آدمی اجتناب کرتا ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے سر میں کچھ بننے اور آگے بڑھنے اور بڑھ کر کچھ پا لینے اور جا لینے کا سودا موجود ہو۔ کچھ شہرت کا لپکا، کچھ پبلسٹی کا چسکا، کچھ کیمرے کی چشم بلوریں کی مسحوریت، کچھ اپنے لیے مقام اعتبار (IMMAGE) حاصل کرنے کا جنون اور کچھ اپنا نقش (PROJECTION) اجاگر کرنے کا خبط۔ یہ سب آسیب ہیں۔ کہیں یہ آسیب تو سایہ نہیں ڈال رہا ہے۔ ایسا ہی ان محرکات کے تحت آدمی قوت سے بڑھ کر تگ و تاز کرتا ہے مگر اصل مقصد کے لحاظ سے کوئی خاص موثر پیشقدمی نہیں ہوتی۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ جہاں کہیں کوئی مخالف مل جاتے اس پر تمہیں پیار آتا ہو اور ایسے لوگوں کے ٹیڑھے نظریات سے فوراً ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہو۔ یہ بھی غلط عوامل کا نکاس ہے۔

پیارے ساتھی! ان ساری باتوں کو سامنے رکھ کر اپنا ذہنی تجزیہ خود کرو۔ اور اپنی نیت کے چشمے کو گدلا کرنے والی ہر چیز کو باہر نکال پھینکو۔ یہی راہ فلاح ہے۔ کیوں اپنے آپ کو خراب

کرتے ہو، اور اپنے سامنے دوسروں کو مشکلات میں ڈالتے ہو۔

کدورتیں اور نفرتیں اور مخفی انتقامی جذبے ذہن کی کمین گاہوں میں چھپ کر وار کرنے والے رہزن ہیں۔ یہ منفی قوتیں اسلام کے کسی سپاہی کے لیے سخت ضرر رساں ہیں۔ اِن کی وجہ سے اصل دعوت اور اصل مقصد کو جو نقصان پہنچتا ہے اور خدا کی راہ میں محنتیں کھپانے والے اچھے بھلے سپاہیانِ حق کے اندر جو اضطراب اور انتشار پیدا ہوتا ہے، آخرت میں اس کا حساب کتاب ہوتا ہے۔ آج خود ہی آڈٹ کر کے دیکھ لو کہ تمہارے حساب کتاب کے اس کھاتے کی میزان درست ہے؟

یہاں تو آدمی اپنے رویّوں کا ذہنی و جذباتی پس منظر چھپا سکتا ہے، خوبصورت تاویلیں کرسکتا ہے، پُرزور دلائل دے سکتا ہے، بہترین لفاظی کر سکتا ہے، مگر آخرت پر ایمان رکھنے والوں کو تو اپنے مرعوب کُن دلائل اور خوش نما تاویلوں کے پس منظر میں کام کرنے والے مخفی عوامل کو اچھی طرح شناخت کر لینا چاہیے، اور اس کا اندازہ بھی کرلینا چاہیے کہ وہاں کی عدالت میں اعمال کے عیاں اور پنہاں پہلوؤں کو واضح کر کے کیسی جرح کی جائے گی۔ اور کیا اُس جرح کا سامنا کیا جا سکے گا؟

دیکھو کہ جس خطۂ زمین کو تم نے مسجد کی مانند قرار دیا تھا، کیونکہ یہ اسلامی نظام کے لیے وقف ہو چکی ہے، اُس کے گرد خطرات منڈلا رہے ہیں، اور اس کے اندر سیاسی گھٹن کے علاوہ اخلاقی بحران پھیلا ہوا ہے۔ دولت پرستی، زرِحرام کی چاٹ، رشوت، خیانت، قانون شکنی، کام چوری، کمزوروں پر ظلم، مجبوروں کا استحصال، ڈاکے اور اغوا، اسراف اور تبذیر، فحاشی اور جنس پرستی، طبقاتی، فرقہ وارانہ اور علاقائی نزاعات، جیسے کتنے ہی روگ پھیلے ہوتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ایک سیلابِ بلا ہے جو ٹوٹ پڑا ہے۔

عزیز ساتھی! تمہارا کام یہ ہے کہ ذہن سے ساری پراگندہ خیالیوں کو جھٹک دو، اور کوئی ساتھی مِلے تو بہت اچھا، نہ ملے تو تنِ تنہا نِکل کھڑے ہو، کہیں سے رہنمائی اور مشورہ حاصل ہو تو بہت خوب، ورنہ قرآن و حدیث سے رہنمائی لو اور صحت مند دینی لٹریچر سے مشورہ طلب کرو۔ ایک ایک اور دو دو کر کے، سروسامان کے ساتھ بھی اور بے سروسامانی کے عالم میں بھی خدا کی راہ میں قدم بڑھاؤ۔

ڈوبتوں کو بچاؤ۔ جو ابھی تک ڈوبنے سے بچے ہوئے ہیں اُن کو محفوظ بلند مقامات تک پہنچاؤ۔ جو محفوظ ہو گئے ہیں اُن کو رُوحانی غذا پہنچاؤ۔ جو بیمار ہیں ان کو دواخانۂ ایمان و اخلاق سے ادویہ فراہم کرو۔ جو وبازدگی کے خطرے میں ہیں اُن کو خوفِ خدا کے انجکشن لگاؤ۔

کام اتنا ہی نہیں، تمہاری ذمہ داری یہ بھی ہے کہ سیلاب کی آفت سے بچ نکلنے والوں کو تم جہاد کے لیے تیار کرو۔ جہاد کے لیے اوّلاً صحیح اعتقاد کی ضرورت ہے، جہاد کے لیے اتحاد کی ضرورت ہے، اور جہاد کے لیے اجتہاد کی ضرورت ہے۔ اسلام میں کوئی لمحہ ایسا نہیں آتا کہ فریضۂ جہاد ساقط ہو جائے۔ کبھی تلوار سے جہاد، کبھی زبان و قلم سے جہاد، کبھی جسم اور مال سے جہاد، اور کبھی دل و دماغ سے جہاد۔

اُٹھو، کتنے بھاری فرائض تم کو بلا رہے ہیں۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

انٹرویو نمبر

ترجمان القرآن

انٹرویو نمبر

اکتوبر ۱۹۸۰ء

ایک تاریخی یادگار

مولینا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

کا

ایک اہم مفصل انٹرویو

جو ریڈیو پاکستان کی طرف سے

۱۹۷۶ء میں لیا گیا تھا

ترجمان القرآن

کی اشاعتِ خاص میں

پیش کیا جا رہا ہے

- کتابت و طباعت کے لیے غیر معمولی اہتمام
- انٹرویو نمبر کے لیے خصوصی رنگین ٹائیٹل
- مستقل خریداروں اور نئے سالانہ خریداروں کو نمبر کے لیے زائد ادائیگی نہیں کرنی ہوگی۔

منیجر رسالہ

ترجمان القرآن

۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور فون نمبر: ۴۱۰۳۱۶